ماہ نامہ
ہمدرد
نونہال
اکتوبر ۱۹۸۶ء

لحمیات (پروٹینز) کے وجود سے روئے زمین پر حیات ممکن ہوئی!

حیاتِ انسانی اور صحتِ جسمانی کے لئے لحمیات (پروٹینز) خوراک کا ناگزیر حصہ ہیں۔ انسان کی انفرادیت وشخصیت اور اعمال و وظائف کی تکمیل اور خیالات کی توانائی لحمیات کے بغیر ممکن نہیں۔ لحمینا چنیدہ جڑی بوٹیوں' پروٹینز' کاربوہائیڈریٹس اور دیگر غذائی اجزا کا ایک متوازن مرکب ہے۔

روزانہ کے تھکا دینے والے کام جب جسم انسانی کے کل پرزوں کو کمزور کر دیتے ہیں' تو وہ صرف پروٹینز سے دوبارہ نشوونما حاصل کرتے ہیں۔

لحمینا بحیثیت مجموعی جسم انسانی کے لئے ایک مفید اور قابلِ اعتماد غذائی معاون ہے۔

لحمینا کا روزمرہ باقاعدگی سے استعمال جسم انسانی کی نشوونما کو برقرار رکھتا ہے اور جسم میں توانائی پیدا کرتا ہے۔

خاندان کے ہر فرد کے لئے ایک مکمل غذائی ٹانک

لحمینا - برائے اسٹیمنا

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

احسان کا بدلہ نہ اتار سکو تو شکریہ ادا کرو۔

Adarts LA-1/81

ٹیلی فون : 616001 سے 616005

مجلس ادارت

صدر مجلس حکیم محمد سعید

مدیر اعلا مسعود احمد برکاتی

مدیرۂ اعزازی سعدیہ راشد

صفر ـــ ۱۴۰۷ ہجری

اکتوبر ـــ ۱۹۸۶ عیسوی

جلد ـــ ۳۴

شمارہ ـــ ۱۰

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

قیمت فی شمارہ ـــ ۴/۰۰ روپے

سالانہ ـــ ۴۵/۰۰ روپے

سالانہ (رجسٹری سے) ـــ ۸۱/۰۰ روپے

پتا:
ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ
ناظم آباد ۳ کراچی ۱۸

ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا۔

اس رسالے میں کیا ہے؟

مضمون	صفحہ	لکھنے والے
جاگو جگاؤ	۳	جناب حکیم محمد سعید
پہلی بات	۴	مسعود احمد برکاتی
اے بہادر کسان (نظم)	۵	جناب عبدالحفیظ ظفر
خیال کے پھول	۶	ننھے گل چیں
انسان مختلف ہوتے ہیں	۷	ادارہ
باشو اور کریم کا کارنامہ	۱۱	جناب مناظر صدیقی
باغ کی سیر (نظم)	۱۷	جناب تنویر پھول
عظیم ادیب اور موجد	۱۹	جناب عبدالرحیم
طب کی روشنی میں	۲۱	جناب حکیم محمد سعید
مرزا کے جوتے	۲۵	جناب ذوالفقار محسن
ویسٹ انڈیز کرکٹ	۲۹	جناب ساجد علی ساجد
تتلی (نظم)	۳۲	جناب افق دہلوی
ثمینہ اور اس کا پھول	۳۳	جناب میرزا ادیب
سارس بادشاہ	۳۹	جناب ڈاکٹر شمیم حنفی
جی ہاں	۵۱	جناب فیض احمد فیض
ہمدرد انسائیکلو پیڈیا	۵۲	جناب علی ناصر زیدی
نونہال مصور	۵۵	ننھے آرٹسٹ
اخبار نونہال	۵۶	ننھے صحافی
تحفے	۵۹	باذوق نونہال
معلومات عامہ ۴۴۲	۶۳	ادارہ
چار دوست	۶۵	جناب علی اسد
مسکراتے رہو	۶۷	ننھے مزاح نگار
کارٹون	۷۰	جناب مشتاق
وارث کی تلاش (۲)	۷۱	جناب مناظر صدیقی

● منتخب کہانیاں ۷۹ ● نونہال ادیب ننھے لکھنے والے ۸۷ ● صحت مند نونہال ادارہ ۱۰۱ ● اس شمارے کے مشکل الفاظ: ادارہ ۱۰۳ ● ننھے قارئین لکھتے ہیں نونہال پڑھنے والے ۱۰۴ ● معلومات عامہ ۴۴۲ کے جوابات ادارہ ۱۰۹

اس رسالے کی تمام کہانیوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ ان میں سے کسی کی کسی حقیقی شخص یا واقعے سے مطابقت محض اتفاقی ہو سکتی ہے جس کے لیے ادارہ ذمے دار نہ ہوگا۔

حکیم محمد سعید پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاگو جگاؤ

انسان دنیا میں رہتا ہے تو اس کو ہر قسم کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ سونے جاگنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے سے لے کر پڑھنے لکھنے تک ہر کام ضروری ہے۔ یہ سب کام زندہ رہنے کے لیے ہیں۔ ہر انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اسلام نے بھی ہمیں ان کاموں سے نہیں روکا ہے، بلکہ ان کاموں کو صحیح طریقے سے کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بعض لوگ دنیا کی محبت کو بُرا کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا سے نفرت کرنے کی تعلیم دی ہے، لیکن ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اسلام فطری مذہب ہے۔ وہ کسی ایسے کام کو منع نہیں کرتا جو فطرت کے مطابق ہو اور جس کو کرنے سے دوسرے انسانوں کو یعنی اللہ کی مخلوق کو تکلیف نہیں پہنچتی ہو۔ مثال کے طور پر ہر آدمی کو زندہ رہنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا پیسے کمانا بُرا یا ناجائز نہیں ہے، لیکن یہ کمائی محنت اور دیانت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ محنت کے بغیر اور دھوکا دے کر یا جھوٹ بول کر جو پیسہ کمایا جائے وہ اچھا نہیں ہے اور اسلام نے اس کو حلال قرار نہیں دیا ہے۔ ایسے پیسے میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح علم حاصل کرنا بھی بڑی اچھی بات ہے، چاہے وہ علم دین کا ہو یا سائنس کا، لیکن علم حاصل کرنے میں بھی کوئی غلط طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ علم تو حاصل ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ زندگی گزارنے کا صحیح راستہ معلوم ہو۔ صحیح راستہ یہی ہے کہ انسان دنیا میں رہے، لیکن دین کو نہ بھولے۔ ہر کام کرے، لیکن نیت اچھی رکھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو یاد رکھے۔ دنیا کی محبت کو اعلا اصولوں پر، سچائی، ایمان داری، شرافت اور انسانیت پر غالب نہ آنے دے۔ ہر کام کرتے وقت جہاں اپنا، اپنی بھلائی کا خیال رکھتا ہے وہاں ملک اور ملّت کا بھی خیال رکھے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

خاص نمبر شائع ہوا، بازار پہنچا اور چند دن میں چٹنی ہو گیا۔ جن نونہالوں کو خاص نمبر ملنے میں دقت ہوئی یا نہیں مل سکا ہم ان سے معافی چاہتے ہیں اور خاص نمبر پسند کرنے پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

بعض نونہالوں نے لکھا ہے کہ خاص نمبر اگست کے مہینے میں شائع کیا جائے تو زیادہ اچھا ہو۔ جن نونہالوں نے اپنی رائے نہیں لکھی ہے وہ ایک کارڈ یا ایک چٹ پر لکھ کر بھیج دیں کہ وہ خاص نمبر جولائی میں چاہتے ہیں، اگست میں یا ستمبر میں؟ یہ جملہ وہ خط میں دوسری باتوں کے ساتھ نہ لکھیں بلکہ الگ کاغذ پر لکھیں۔ بعض نونہال "ننھے قارئین لکھتے ہیں" میں شائع کرانے کے لیے خط لکھتے ہیں وہ اس میں اپنی کہانیوں وغیرہ کے متعلق بھی لکھ دیتے ہیں، یہ طریقہ بھی درست نہیں ہے۔ یہ دونوں خط الگ الگ کاغذ پر لکھنے چاہییں۔ ایک لفافے میں کئی کاغذ آسکتے ہیں۔

ہاں خوب یاد آیا بعض نونہالوں نے "ننھے قارئین لکھتے ہیں" کے عنوان پر اعتراض کیا ہے۔ تو پھر آپ بتائیے اِن میں سے کون سا عنوان آپ کو پسند ہے:

الف : ہمارے قارئین

ب : پڑھنے والوں کے فیصلے

ج : قارئین کے فیصلے

د : قارئین کی عدالت

جو عنوان آپ کو پسند ہوگا وہی اختیار کر لیا جائے گا، مگر رائے جلدی لکھیں۔

یہ شکایت بھی کبھی کبھی آجاتی ہے کہ سوالات مشکل دیے جا رہے ہیں۔ آیندہ ہم کچھ کم مشکل سوالات دینے کی کوشش کریں گے، بالکل آسان دے دیں تو پھر آپ اپنی معلومات کیسے بڑھائیں گے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو معلومات آپ کو نہیں ہے وہ کتابوں میں دیکھیں، بڑوں سے پوچھیں، آپس میں ساتھیوں سے پوچھیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ مزہ بھی جب ہی آتا ہے۔ دس کے بجائے بارہ سوالات بھی اسی لیے کیے گئے ہیں کہ اگر پورے جوابات نہ بھی معلوم ہو سکیں تب بھی نام تو چھپ جائے۔ علم بھی بڑھے اور نام بھی ہو۔

خاص نمبر کی قدر کرنے کا ایک بار پھر شکریہ۔

اے بہادر کسان

عبدالحفیظ ظفر

تیرے چہرے پہ ہے تیری محنت کا نور
تُو ہے اِس دیس کی عظمتوں کا غرور
خشک مٹّی بھی سونا اُگلنے لگی
جب سے دنیا میں تیرا ہوا ہے ظہور
تیرے چہرے پہ ہے تیری محنت کا نور

تیری ہمّت ترا حوصلہ لازوال
اے کسان اس جہاں میں ہے تُو بے مثال
تجھ سے کرتا ہوں وعدہ کہ ہر حال میں
گیت گاؤں گا تیری وفا کے ضرور
تیرے چہرے پہ ہے تیری محنت کا نور

سب کو دل چسپی ہے تیرے اس روپ سے
خوف کھاتا نہیں تُو کڑی دھوپ سے
ہے مشقّت تری زندگی کا اُصول
عیش و آرام سے کس قدر تُو ہے دُور
تیرے چہرے پہ ہے تیری محنت کا نور

خیال کے پھول

★ حضور اکرمؐ ـــ وہ شخص مومن نہیں ہے جو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

مرسلہ: شبیر بن خاں، مہمند ماتمرہ

★ حضرت عثمانؓ ـــ گناہ کسی نہ کسی صورت میں دل کو بے چین رکھتا ہے۔

مرسلہ: سید کامل افتخار احمد، نواب شاہ

★ بایزید بسطامیؒ ـــ انسانی کردار کو چار چیزیں بلند کرتی ہیں: علم، عمل، کرم اور خوش کلامی۔

مرسلہ: شہناز ہاشمی، کراچی

★ امام غزالی ـــ تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں: حرص، حسد اور غرور۔

مرسلہ: سید محمد اطہر لاڈکانہ

★ جابر بن حیان ـــ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔

مرسلہ: جاوید اقبال کھتری، لیاری

★ قائد اعظم ـــ علم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔

مرسلہ: محمد ایوب، چمن

★ لائڈ جارج ـــ سنہرے اقوال صرف کتابوں اور ڈائریوں کی زینت بننے کے لیے نہیں ہیں، بلکہ اس لیے ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔

مرسلہ: عالیہ بتول، کراچی

★ ہربرٹ اسپنسر ـــ عافیت اور امن درکار ہے تو آنکھ اور کان سے زیادہ کام لو اور زبان کو بند رکھو۔

مرسلہ: خواجہ عمر فاروق، کراچی

★ فریڈرک اعظم ـــ جس گھر میں نیک اور تعلیم یافتہ ماں ہو وہ گھر انسانیت اور تہذیب کی یونی ورسٹی ہے۔

مرسلہ: عمران شفیع، کراچی

★ نوشیروان عادل ـــ انصاف ایک ایسا قلعہ ہے، جسے نہ آگ جلا سکتی ہے نہ منجنیق گرا سکتی ہے۔

مرسلہ: نوید الحق انصاری، کراچی

★ رحمان بابا ـــ اگر تم ساز و سامان کھو چکے ہو تو کوئی بات نہیں، امید کا دامن مت چھوڑو اور اللہ پر بھروسا اور یقین رکھو۔

مرسلہ: شوکت علی خٹک، کراچی

★ جبران خلیل جبران ـــ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔

مرسلہ: عبدالرشید فاروقی، جھنگ

★ حکیم محمد سعید ـــ علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مرسلہ: عبدالرزاق ندیم، کراچی

انسان مختلف ہوتے تھے

انسانوں کے بارے میں ایک روبوٹ کا بیان

میں ایک مشینی آدمی یعنی روبوٹ ہوں!

میرا کام آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کرنا ہے۔ میں خاص طور پر خلا میں اپنے اطراف بکھرے ہوئے بہت سے مُردہ سیاروں پر کھدائی کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا انسان ہم روبوٹس (ROBOTS) سے مختلف ہوتے تھے؟ کیا واقعی ان میں اور ہم میں فرق ہوتا تھا؟ میں آپ کو بتاؤں کہ صرف ایک مرتبہ میرا اور ایک انسان کا ساتھ ہوا تھا۔ میں نے اس انسان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ انسان اور اس کا نظام اتنا سیدھا سادہ نہیں ہوتا جتنا ہمیں اسکول میں بتایا جاتا تھا۔

ہمارے پاس انسانوں کے متعلق بہت تھوڑی معلومات تھیں۔ یہ معلومات ہمیں اس طرح ملی تھیں کہ ان میں بہت سی باتیں بیچ میں سے غائب تھیں اور ہم روبوٹس کو خود کوشش کر کے یہ خالی جگہیں پُر کرنی پڑتی تھیں، لیکن اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس کوشش سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، یعنی ہم کوئی خاص نتیجہ نہیں نکال سکے۔ ہمیں معلوم ہے اور تاریخ جاننے والے روبوٹس بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان زمین نامی ایک سیارے سے آئے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انسانوں نے بڑی بہادری سے ایک سیارے سے دوسرے سیاروں کا سفر کیا تھا۔ وہ جس سیارے پر بھی رُکے انھوں نے وہاں اپنی نو آبادیاں بنالیں یعنی ان سیاروں پر انسانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ کبھی وہاں صرف انسان رہتے اور کبھی روبوٹس اور کبھی دونوں۔ بہرحال وہ جہاں گئے وہاں سے واپس نہیں ہوئے۔

ہمارے سائنس دانوں نے ہمیں بتایا تھا کہ انسانوں میں بھی ایک ڈھانچا ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ انسانوں کا ڈھانچا ہم روبوٹس کے ڈھانچے سے مختلف نہیں ہوتا تھا، یعنی ان کا ڈھانچا ہماری طرح کا ہی ہوتا تھا۔ بس اتنا سا فرق ہوتا کہ انسانوں کا ڈھانچا کیلسیم کے ایک

مرکب سے بنا ہوتا تھا، جب کہ ہمارا ڈھانچا ٹیٹانیم دھات کا ہوتا ہے۔ بناوٹ میں بھی معمولی سا فرق ہوتا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ ایک انسان سے صرف ایک مرتبہ میرا واسطہ پڑا ہے۔ ہوا یہ کہ اپنے کام کے لیے مختلف سیاروں پر جانے کا جو پروگرام مجھے بنایا گیا تھا اس پروگرام کے مطابق صرف چند سیارے رہ گئے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ آخری سیارہ رہ گیا تھا۔ یہ سیارہ ہمارے سیاروں کے نظام میں اندرونی طرف تھا۔ اس سیارے پر پہنچنے کے بعد اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ اس سیارے پر بہت دنوں سے رہ رہا تھا۔ وہ شاید انسانوں کی نسل میں سے آخری انسان تھا۔ اس سیارے پر رہتے ہوئے اُسے کتنے دن ہوئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت دنوں تک تنہا رہنے کی وجہ سے، چوں کہ اُسے کسی سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس لیے وہ بات کرنا ہی بھول گیا تھا۔ مجھے اس آدمی کو اپنی زبان سکھانی پڑی۔ پھر جب اُس نے ہماری زبان سیکھ لی تو اس کے ساتھ اچھا وقت گزرنے لگا۔ میں سوچتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ اپنے سیارے پر لے آؤں گا، لیکن میرا ارادہ پورا نہیں ہو سکا، کیوں کہ اسے کچھ ہو گیا تھا جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس آدمی نے اچانک گرمی کی شکایت کی۔ میں نے اس کا ٹمپریچر دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس آدمی کے اندر حرارت کی پیمائش کرنے والے آلے میں خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے تار جل گئے ہوں۔ میرے پاس فاضل پرزوں کا تھیلا موجود تھا۔ یہ تھیلا سفر کے دوران ہر وقت میرے پاس رہتا تھا، تاکہ کوئی پرزہ خراب ہو جائے تو میں خود ہی اس پرزے کو بدل لوں۔ اس آدمی میں خرابی پیدا ہو ہی گئی تھی، چناں چہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا خراب پرزہ بدل دوں۔

میں دیر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ اس آدمی کا مشینی نظام بند کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی سوئی اس کی گردن میں داخل کی تاکہ حرارت کی پیمائش رکھنے والے آلے کا سوئچ کھول کر نکال لوں۔ جیسے ہی اپنی سوئی اس کی گردن میں داخل ہوئی اس آدمی کی حرکت بالکل بند ہو گئی یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، کیوں کہ ہم روبوٹس کی حرکت بھی اسی طرح بند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس آدمی کا بدن کھول دیا۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بدن کے اندر انسانوں کا سارا نظام ہم روبوٹس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ میرے پاس جو فاصل پرزہ تھا وہ اس آدمی میں نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس آدمی کا جسم دوبارہ بند کر دیا جائے، کیوں کہ اس کے جس پُرزے میں خرابی تھی اُس سے صرف اس کا جسم زیادہ گرم ہو رہا تھا۔ باقی تمام چیزیں ٹھیک تھیں، لیکن جب میں نے اس کا جسم دوبارہ جوڑ کر بند کر دیا تو بھی اس نے معمول کے مطابق حرکت نہیں کی۔ میں نے اُسے دوبارہ چلانے کی بہت کوشش کی، لیکن مجھے کام یابی نہیں ہو سکی۔ مجھے اپنے مرکز پر واپس پہنچنا تھا، کیوں کہ جو پروگرام مجھے دیا گیا تھا اس کے مطابق اس سیارے پر رُکنے کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ میں اپنے مرکز پر واپس آ گیا۔ پھر تقریباً ایک سال بعد مجھے اُس سیارے پر دوبارہ جانا پڑا۔ میں جب اُس جگہ پہنچا جہاں میں نے اس آدمی کو چھوڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں اس آدمی کی ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین آ گیا کہ آدمی واقعی ہم روبوٹس سے مختلف ہوتے تھے۔

صحت کی الف بے

مسعود احمد برکاتی

جس طرح خوش بُو اور رنگ یک جا ہوتے ہیں اُسی طرح کردار اور صحت بھی یک جان ہوتے ہیں۔

صحت کی الف بے میں صحت و تن دُرستی کی بنیادی باتیں آسان اور انتہائی دل کش انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

باتوں باتوں میں
کام کی باتیں

قیمت: ——— چار رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد سنٹر
ناظم آباد کراچی ۱۸۔

mayfair
Milk Bon Bon
مے فیئر
مِلک بون بون
دُودھ اور گلوکوز سے تیار شدہ
توانائی سے بھرپور
Milk
Bon Bon
Only The Best
mayfair
sweets.toffees.bubble
ایشین فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی

Adarts

ہاشو اور کریم کا کارنامہ

مناظر صدیقی

ہاشو اور کریم دونوں بھائی تھے۔ ہاشو کراچی کے پاس ہی مچھیروں کی ایک بستی میں رہتا تھا۔ اس کے ابّا اس بستی کے سردار تھے۔ ساری بستی والے ان کی عزّت کرتے تھے۔ ان کے پاس مچھلیاں پکڑنے کی کئی کشتیاں تھیں۔ ان میں سے دو ایک کشتیاں ایسی بھی تھیں جن میں موٹر لگی ہوئی تھی، یعنی یہ موٹر بوٹ تھیں۔ ہاشو موٹر بوٹ چلانا اچھی طرح جانتا تھا۔ کبھی کبھی وہ موٹر بوٹ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کو نکل جاتا۔ اُسے سمندر کی اونچی نیچی لہروں میں موٹر بوٹ چلانا بہت اچھا لگتا تھا۔ یوں بھی بڑے ہو کر اسے اپنے ابّا کی جگہ لینی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ابّا بھی تو بستی کے سردار ہونے کے باوجود مچھلیاں پکڑنے کے لیے اکثر بستی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ سمندر میں

جاتے ہیں۔ کریم ہاشو کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کے ابا کا شہر میں کاروبار تھا۔ جمعے کی چھٹی کے دن یا تو کریم ہاشو کے پاس چلا جاتا یا ہاشو کریم کے پاس شہر آجاتا۔ اس روز کریم ہاشو کے پاس شہر آیا ہوا تھا۔ کریم کی فرمائش پر ہاشو نے موٹر بوٹ نکال لی تھی اور دونوں سمندر کی سیر کر رہے تھے۔

ہاشو موٹر بوٹ چلا رہا تھا اور کریم اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھانے لگے تھے۔ بادلوں کو دیکھ کر ہاشو نے موٹر بوٹ کا رُخ ساحل کی طرف موڑ لیا۔ کریم بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک پرندہ اُڑتا ہوا نظر آیا۔ یہ پرندہ سمندر میں اُڑنے والے پرندوں سے مختلف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور پرندہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے اُڑتا ہوا پہلے پرندے کی طرف آرہا تھا، جیسے اس پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ پھر واقعی اس نے پہلے پرندے پر حملہ کر دیا۔ پہلا پرندہ ہوا میں غوطہ لگا کر اس حملے سے بچ گیا۔ اس پرندے نے حملے سے بچنے کے لیے جس طرح ہوا میں غوطہ لگایا تھا۔ اُس سے ہاشو اور کریم کو اندازہ ہو گیا کہ جو پرندہ انھیں پہلے نظر آیا تھا وہ کوئی کبوتر ہے اور اس پر حملہ کرنے والا پرندہ شکرا ہے۔ شکرا شکاری پرندہ ہوتا ہے۔ اُڑتے ہوئے پرندوں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھا جاتا ہے۔ شکرے کے پہلے حملے سے تو کبوتر نے خود کو بچا لیا، لیکن دوسری بار جب اُس نے کبوتر پر حملہ کیا تو کبوتر خود کو نہ بچا سکا۔ شکرا کبوتر کو اپنے پنجوں میں دبا کر ساحل کی طرف لے جانے لگا۔ ہاشو اور کریم کو بے چارے کبوتر پر بڑا ترس آیا۔ کریم نے ہاشو سے تیز چلنے کی فرمائش کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ دونوں خشکی پر پہنچ جانے کے بعد کبوتر کو بچا سکیں۔ ہاشو نے کشتی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ دونوں شکرے کو ڈرانے کے لیے ساتھ ساتھ شور بھی مچا رہے تھے۔

نہ جانے یہ ہاشو اور کریم کے شور مچانے کا اثر تھا یا موٹر بوٹ کی مسلسل چک چک کی آواز تھی یا کوئی اور ہی سبب تھا کہ خشکی پر پہنچتے ہی شکرے نے کبوتر کو چھوڑ دیا اور خود اُڑتا ہوا دُور نکل گیا۔ اتنی دیر میں ان کی موٹر بوٹ بھی ساحل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہاشو تو موٹر بوٹ کو ایک جگہ روکنے کے لیے لنگر ڈالنے لگا، لیکن کریم نے فوراً ہی کشتی سے چھلانگ لگا دی اور تیز تیز چلتا ہوا خشکی کی طرف بڑھنے لگا۔ خشکی پر پہنچنے کے بعد کریم تیزی سے دوڑتا ہوا اُس جگہ پہنچا جہاں اس کے اندازے کے مطابق کبوتر گرا تھا۔ جلد ہی اسے کبوتر نظر آ گیا۔ اس نے لپک کر کبوتر اُٹھا لیا۔ اتنی دیر میں ہاشو بھی پہنچ گیا تھا۔ دونوں نے کبوتر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن کبوتر مر چکا تھا۔

انھیں بڑا افسوس ہوا کہ ان کی یہ بھاگ دوڑ کسی کام نہیں آئی۔ کبوتر کو دیکھتے وقت انھیں کبوتر کی ایک ٹانگ سے بندھی ہوئی ایک نلکی نظر آئی۔ یہ نلکی ایسے کاغذ سے بنی ہوئی تھی جس پر پانی کا اثر نہیں ہوتا۔ دونوں نے یہ نلکی کھول لی۔ کریم نے کہا،

"یہ پیغام رساں کبوتر ہے۔ اس کے پیر سے شاید کسی کا کوئی پیغام بندھا ہوا ہے۔"

"پھر تو ہمیں اسے کھول کر پڑھنا چاہیے، شاید اس میں پتا اور نام لکھا ہو۔ ہم یہ پیغام اس شخص کو پہنچا دیں گے۔" ہاشو نے کہا اور اپنی جیب سے چھوٹا سا چاقو نکال کر نلکی کو چیر دیا۔ نلکی کھلتے ہی اس میں سے تین چمک دار شیشے جیسے پتھر نکل کر اُس کی ہتھیلی پر آ گئے۔

"ارے، یہ تو ہیرے ہیں۔" کریم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، یہ ہیرے ہی ہیں۔" ہاشو نے تائید کی۔

"کیا ان کے ساتھ کوئی پتا بھی ہے۔" کریم نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی پتا نہیں ہے۔" ہاشو نے جواب دیا۔

"پھر ہم ان ہیروں کا کیا کریں گے۔ ہیرے کس کو پہنچائیں گے؟" کریم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم انھیں پولیس کے حوالے کر دیں۔" ہاشو نے مشورہ دیا۔

"یہی ٹھیک ہے۔" کریم نے مشورہ پسند کیا۔

"بس پھر جلدی چل پڑو۔ رات ہونے والی ہے۔ ہمیں کشتی کھڑی کرنے کے لیے کھاڑی تک پہنچنے میں بھی کافی دیر لگ جائے گی۔ پھر وہ دونوں بھاگتے ہوئے اپنی کشتی تک پہنچے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اُس کھاڑی تک پہنچے جہاں ہاشو کی کشتیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ یہاں ایک ٹین کا شیڈ بنا ہوا تھا، جس کے نیچے کشتیوں کو باندھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر اپنی کشتی باندھ دی۔ پھر وہ اس شیڈ سے باہر نکلے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابھی ان کا گاؤں تقریباً ایک میل دُور تھا۔ انھیں جلد ہی اپنے گاؤں تک پہنچنا تھا، لیکن جیسے ہی وہ شیڈ سے باہر نکلے۔ کسی نے پیچھے سے کریم کی گردن پکڑ لی۔ اس اچانک حملے سے کریم کی چیخ نکل گئی۔ کریم کی چیخ پر ہاشو نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ سر کے بال کندھوں تک تھے۔ چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہاشو نے کہا،

"ارے آپ بابا؟" ہاشو انھیں دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ اس لیے وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

بابا اس کے گاؤں سے کچھ دُور ایک پہاڑی غار میں رہتا تھا۔ سمندر کے کنارے پانی کے کٹاؤ سے ہاشو کے گاؤں کے قریب اونچی اونچی پہاڑیاں سی بن گئی تھیں۔ ان میں کئی غار بھی بن گئے تھے۔ انھی غاروں میں سے ایک میں یہ بابا رہتا تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ بابا کے پاس کھانے پینے کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی جمعرات کے دن لمبی لمبی چمک دار موٹریں اس کے غار کے پاس آتیں۔ گاؤں والے بے چارے پڑھے لکھے تو تھے نہیں اس لیے وہ اسے کوئی بزرگ سمجھنے لگے تھے۔ گاؤں میں کسی کو بھی اس کا نام نہیں معلوم تھا اس لیے لوگ اسے بابا کہنے لگے تھے۔ اسی لیے اُسے یہاں کریم کا گریبان پکڑے دیکھ کر ہاشو کو حیرت ہو رہی تھی۔

"میں نے تمھیں کبوتر کو اُٹھا کر دیکھتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کبوتر کے پاس سے تمھیں جو کچھ ملا ہے وہ میرے حوالے کر دو۔" بابا نے کہا۔ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"ہمیں اس کے پاس سے کوئی چیز نہیں ملی۔" کریم نے ہمت کر کے کہا۔

بابا نے گرج دار آواز سے کریم کو ڈانٹا، "بکو مت! کبوتر کے پاس سے تمھیں ایک نلکی میں ہیرے ملے ہوں گے۔ انھیں میرے حوالے کر دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر بابا نے کریم کی کلائی پکڑ کر مروڑ

دی۔ کریم کی ایک اور چیخ نکل گئی۔

ہاشو اب حیران کھڑا بابا کی باتیں سُن رہا تھا، لیکن جب اس نے کریم کی کلائی مروڑی تو ہاشو سے چپ نہ رہا گیا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے بابا کی پنڈلی پر لات رسید کی۔ بابا کو شاید امید نہیں تھی کہ ہاشو اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے گا۔ ہاشو کے موٹے جوتوں سے اس کی پنڈلی پر بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ وہ یہ چوٹ برداشت نہیں کر سکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس طرح اس کے ہاتھ سے کریم کی کلائی بھی چھوٹ گئی۔ دونوں بھائیوں کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُن کا رُخ گاؤں ہی کی طرف تھا، لیکن ہاشو کی لات اتنی زوردار تو تھی نہیں کہ بابا ہمیشہ کے لیے بے کار ہو جاتا۔ وہ بھی جلد ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں کا پیچھا کرنے لگا، لیکن اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اپنے وزن کی وجہ سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے دونوں بھائیوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک جگہ سمندری کائی پر سے کریم کا پیر پھسل گیا۔ اس نے فوراً ہی اُٹھ کر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی، لیکن اس کے پیر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے ہاشو سے کہا، "مجھے کچھ دیر سستانا پڑے گا۔"

"نہیں، نہیں، ہمت سے کام لو۔ اگر اس نے تمھیں دوبارہ پکڑ لیا تو وہ نہ جانے کیا کرے گا۔ جلدی کرو، ہم سامنے والے سائبان کے نیچے چھپ جائیں گے۔" ہاشو نے سمجھایا۔

دونوں بھائی بھاگ کر سائبان تک پہنچے، لیکن اندھیرے میں انھیں مچھلیاں پکڑنے والا وہ جال نظر نہیں آیا جو دن میں کسی نے سوکھنے کے لیے سائبان پر ڈال دیا تھا۔ اس جال سے ٹکرا کر پہلے ہاشم گرا، پھر کریم، لیکن دونوں جلد ہی سنبھل گئے اور جال کے پیچھے چھپ گئے۔ اس وقت کریم کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے جلدی جلدی وہ ترکیب ہاشو کو بھی سمجھا دی۔

جال باریک تاروں سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ دونوں نے بڑی جلدی میں جال کا دوسرا سرا تلاش کیا تاکہ اس سرے پر جو تار بندھے ہوئے ہیں انھیں کھول دیں۔ آخر انھیں دوسرا سرا مل ہی گیا۔ دونوں نے تار کھول کر جال ہاتھوں میں تھام لیا، لیکن جال بہت وزنی تھا۔ ہاشو تو خیر اپنے گاؤں کے لوگوں کے ساتھ جال پکڑنے اور اُسے اٹھانے کا عادی تھا پھر بھی وہ اکیلا تو جال نہیں اُٹھاتا تھا، اس لیے جال اُس کے لیے بھی وزنی تھا، لیکن کریم کے لیے جال کو سنبھالے رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک آدھ بار ہاشو سے کہا بھی کہ اس کے ہاتھ سے جال چھوٹا جا رہا ہے، لیکن ہاشو

نے اس کی ہمت بندھائی، کیوں کہ وہ بابا کے پیروں کی چاپ بھی سُن رہا تھا۔ ہاشو کے کہنے پر کریم نے مضبوطی سے تار پکڑ لیے۔ پھر بھی وزنی جال اس کے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا، خیر اس سے پہلے کہ جال اس کے ہاتھ سے نکل جاتا بابا ان کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں بھائیوں نے کوشش کر کے بڑی پھرتی سے وہ جال بابا پر اُچھال دیا۔ جال ٹھیک بابا کے اوپر گرا، جس سے وہ لڑھک کر زمین پر گر پڑا۔ پھر ہاشو اور کریم نے جال کو اس طرح کھینچا کہ بابا بالکل اس میں اُلجھ اور پھنس کر رہ گیا۔

"بھاگو کریم بھاگو" ہاشو نے کہا۔

دونوں بھائی بھاگتے ہوئے جلد سے جلد گاؤں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُدھر بابا جال سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ جتنے ہاتھ پیر چلاتا اتنا ہی پھنستا جاتا۔ ہاشو اور کریم گاؤں میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انھیں ایک سائکل سوار نظر آیا۔ ہاشو نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ بچّل کھوسو تھا۔ پولیس کانسٹیبل بچّل کھوسو ان کے مکان کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی بھی اسی علاقے کے تھانے میں تھی۔ دونوں نے بچّل کھوسو کو روک کر سارا قصّہ سُنا دیا۔ کریم نے اپنی جیب سے وہ ہیرے بھی نکال کر دے دیے۔ بچل وقت ضائع کیے بغیر اُس جگہ پہنچا جہاں بابا جال میں اُلجھا ہوا پڑا تھا۔ بابا گرفتار کر لیا گیا۔

یہ کہانی اخبارات میں چھپی تو ہاشو کے گاؤں کا دو ایک دن تک بڑا چرچا رہا۔ اخباروں کے کئی فوٹو گرافر ہاشو اور کریم کی تصویریں لینے کے لیے آئے اور ان کو بھی بڑی شہرت ملی، ایسی شہرت جس میں عزّت بھی شامل تھی۔

تن درستی

تن درستی کے معنی ہیں تن یعنی جسم کا درست یا صحیح ہونا، اس لیے تن درستی کو عام طور پر صحت کے معنی میں بولتے یا لکھتے ہیں، لیکن غور کیا جائے تو صحت کا مطلب زیادہ وسیع ہے۔ صحت صرف جسم یا تن کے درست ہونے کو ہی نہیں کہتے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جو آدمی بیمار نہیں ہے وہ تن درست یا صحت مند ہے، لیکن صحت اس سے بھی بڑھ کر ایک حالت یا کیفیت ہے۔ صحت ایک ایسی حالت کو کہہ سکتے ہیں جس میں انسان جسمانی، ذہنی اور سماجی لحاظ سے صحیح حالت میں ہو۔

باغ کی سیر

تنویر پھول

آؤ بچو! باغ میں جائیں   رنگیں پھولوں سے مل آئیں
پہلے سُنیں بُلبل کا نغمہ   فرطِ خوشی سے پھر ہم گائیں
آؤ مل کر باغ میں جائیں
دامن پھولوں سے بھر لائیں

کتنا پیارا پیارا ہے یہ   سب پھُولوں سے نیارا ہے یہ
اس کو ہم کہتے ہیں چنبیلی   قومی پھُول ہمارا ہے یہ
آؤ مل کر باغ میں جائیں
دامن پھولوں سے بھر لائیں

گلشن کی شہزادی آئی   دیکھو تتلی کی رعنائی
قوس قزح کا پیراہن ہے   جس نے اس کی شان بڑھائی
آؤ مل کر باغ میں جائیں
دامن پھولوں سے بھر لائیں

بیلا، نسرین اور چنبیلی   نرگس، گیندا، رات کی رانی
رنگ برنگے پھول کھِلے ہیں   یہ ہے سوسن اور وہ جُوہی
آؤ مل کر باغ میں جائیں
دامن پھولوں سے بھر لائیں

دیس بھی اپنا مثلِ چمن ہے   جس پر قُرباں تن من دھن ہے
اس گلشن کے پھول ہیں بچے   جن سے قائم شانِ وطن ہے
آؤ مل کر باغ میں جائیں
دامن پھولوں سے بھر لائیں

تمام طلباء و طالبات کی دلپسند

نوٹ بکس

پی پی پی برانڈ

ملک بھر کے یوٹیلیٹی اور کینٹین اسٹورز اور اسٹیشنری کی
دوکانوں میں مقررہ داموں پر دستیاب ہیں۔

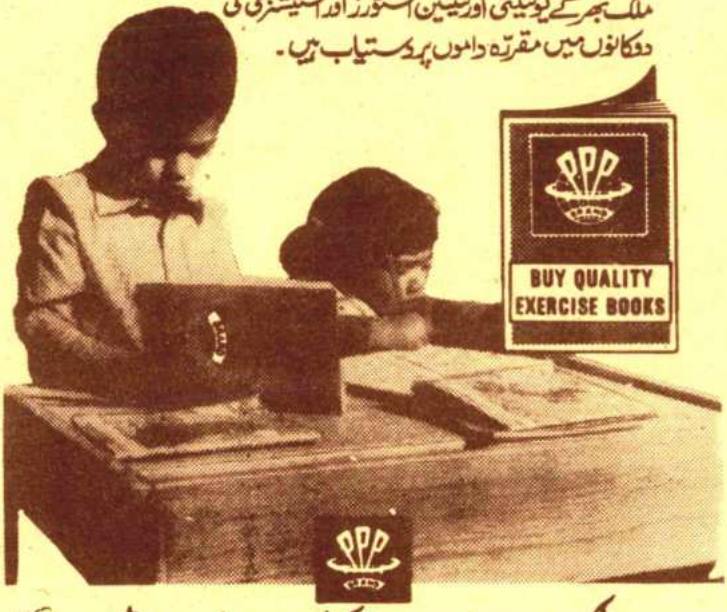

پاکستان پیپر پروڈکٹس لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر ۷۴۳۸ - کراچی ۳

786/PPP-16/84

عظیم ادیب اور موجد

عبدالرحیم

بوسٹن سے بحری جہاز کے اپنے پہلے سفر کے دوران ایک لڑکے نے دیکھا کہ جہاز کے لوگ مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ اس نے گوشت کھانا چھوڑ رکھا تھا، کیوں کہ یہ اس کے نزدیک جان داروں کے غیر ضروری قتل کے برابر تھا، کیوں کہ کسی مچھلی نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا ہے، پھر ہم انھیں کیوں ماریں۔ کسی زمانے میں مچھلیاں بہت پسند تھیں، خاص طور پر کڑھائی سے نکلی ہوئی گرم گرم مچھلیاں، لیکن اس لڑکے کی عمر جب ۱۶ برس کی تھی تو اس نے ایک کتاب پڑھی جس میں گوشت نہ کھانے کے فائدے درج تھے۔ اسی دن سے اس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا اور ساتھ ہی اس نے اپنے لیے سبزیاں تیار کرنی سیکھ لیں۔ اس طریقے سے وہ رقم بچاتا اور یہ رقم کتابیں خریدنے پر خرچ کرتا اور اسے مطالعے کے لیے زیادہ وقت بھی مل جاتا، کیوں کہ اس کا کھانا ہلکا ہوتا یعنی روٹی یا پھل اور پانی کا ایک گلاس۔ ہلکے کھانے کی وجہ سے وہ زیادہ سوچ سکتا تھا۔ خوب پیٹ بھرا ہوا یا بالکل خالی ہو، دونوں صورتوں میں انسان اچھی طرح کام یا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

بات یہ تھی جب اس کی عمر دس برس کی ہوئی تو اسے اسکول سے اُٹھا لیا گیا۔ اس کے باپ کی دو بیویاں تھیں جن سے ۱۷ بچے تھے۔ اس کا باپ اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے اس لڑکے کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا، لیکن یہ لڑکا تمام زندگی علم حاصل کرتا رہا۔ اس کو کتابوں سے بڑی محبت تھی۔ کتابیں کامیاب اور خوش گوار زندگی گزارنے کی کنجی ہیں۔ کتابوں سے نوعمر لڑکے نے لکھنا سیکھا اور دلائل دینے سیکھے، جو بعد کی زندگی میں اس کے بہت کام آئے۔ مطالعے کی وجہ سے وہ اپنا مُدّعا بہت اچھے طریقے سے بیان کر سکتا تھا۔

اس کے باپ کا یہ معمول تھا کہ جہاں تک ممکن ہوتا شام کے کھانے پر کسی دوست یا پڑوسی کو ضرور بُلاتا اور کوئی مفید بات چیت شروع کر دیتا جو اس کے بچّوں کے ذہنوں کو جِلا دے سکے۔ اس طرح اس لڑکے کی توجہ ہونے والی گفت گو پر زیادہ رہتی اور کھانے کی طرف کم۔ اس طرح

اس کی کھانے کی طرف دھیان دینے کی عادت ہی نہیں رہی، یہاں تک کہ چند گھنٹے پہلے کھائی ہوئی چیز بھی اسے یاد نہ رہتی۔ اس کی یہ عادت سفر کے دوران بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی۔ اس زمانے میں سفر کے دوران کھانے کے سلسلے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔

ایک بار جہاز پر سوار لوگ مچھلیاں پکڑ پکڑ کر بھون رہے تھے، گرم گرم مچھلیوں کی خوش بُو اسے بہت اچھی لگی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ وہ مچھلی کھا کر اپنی خواہش پوری کرے یا اپنے گوشت نہ کھانے کے ارادے پر قائم رہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب مچھلیوں کو چیرا گیا تھا تو ان کے پیٹوں میں سے چھوٹی مچھلیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں مچھلیوں سے کہا:

"اگر تم ایک دوسرے کو کھاتی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہم تمھیں نہ کھائیں۔"

پھر اس نے پیٹ بھر کر مچھلی کھائی۔ بعد کے سفروں کے دوران وہ سب لوگوں کی طرح مچھلیاں کھاتا رہا۔

اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ جواز ڈھونڈنا آسان ہے، یعنی آدمی جو کرنا چاہتا ہے اُس کو جائز قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ اس نے اپنی تعریف نہیں کی ہے بلکہ انسان کی کم زوریوں پر نظر ڈالی ہے۔ تاہم کھانے میں اعتدال کے اصول پر وہ ساری عمر کاربند رہا۔

اس کا شمار امریکا کے چوٹی کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ اٹھارھویں صدی کے شروع میں امریکا کی ریاست میساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں پیدا ہوا تھا۔ اُس وقت امریکا پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ وہ بہ یک وقت ادیب بھی تھا اور موجد بھی، سیاست داں بھی تھا اور مزاح نگار بھی۔ وہ غریب پیدا ہوا، لیکن سخت محنت اور کھانے پینے میں اعتدال کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں تک جا پہنچا۔

اس کا ذہن موجد کا ذہن تھا۔ اگر وہ سمجھتا کہ کوئی چیز عام طریقے کے بجائے کسی اور طریقے سے زیادہ اچھی کارکردگی دکھا سکتی ہے تو وہ اس کا ڈیزائن تیار کرتا۔ اسی نے امریکا میں جدید اسٹریٹ لیمپ کا آغاز کیا اور ایسے اسٹوو (چولھے) بنائے جو زیادہ حرارت پہنچاتے تھے۔ یہ تصور بھی اُس نے ہی دیا کہ ایک بڑھتی ہوئی آبادی میں پولیس اور آگ بجھانے کے محکمے ہونے چاہییں اور ایک پبلک لائبریری ہونی چاہیے۔ اس نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس میں بہت اچھی باتیں لکھی ہیں، لیکن دل چسپ اور پُر مذاق انداز میں۔

معلوم ہے یہ بڑا ادیب اور موجد کون ہے۔ اس کا نام آپ نے یقیناً سُنا ہوگا: فرینکلن۔

سوال و جواب

طب کی روشنی میں

حکیم محمد سعید

ہچکی

س: ہچکی کیوں آتی ہے؟ اور یہ بات کہاں تک درست ہے کہ کسی کے یاد کرنے سے ہچکی آتی ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ چھوٹے بچّوں کو ہچکی آنے سے آنتیں بڑھتی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

فوزیہ تبسم، کراچی

ج: ہچکی عام معنی میں معدے کا احتجاج (پروٹسٹ) ہے۔ معدے کی ساخت نازک ہے۔ جب ہم اس نازک معدے میں خوب مرچیں ڈالتے ہیں تو معدے کو اذیت ہوتی ہے اور وہ احتجاج کرتا ہے۔ جو لوگ مزے اور ذائقے کے لیے مرچیں کھاتے ہیں ان کو وارننگ (تنبیہ) تو زبان دے دیتی ہے، لیکن غافل لوگ اس وارننگ کی پروا نہیں کرتے۔ ہچکی کا سبب نفسیاتی بھی ہو سکتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو کسی محبوب کا نام لینے سے توجہ اُدھر چلی جاتی ہے اور ہچکی بند ہو جاتی ہے۔ یہ آنتیں وانتیں بڑھنے کا خیال شاعری ہے۔

شکر کی بیماری

س: عمر ۱۵ سال ہے۔ مجھے شکر کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔

عبدالوحید شیخ، ٹنڈو آدم

ج: بہت افسوس ہوا ہے کہ آپ کو ایک ایسا مرض لگا ہے، جس کا اب تک کوئی شافی علاج معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے اور میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ کو غذائی پرہیز سے اس مرض کی خرابیوں پر قابو پانا چاہیے۔ انسانی جسم میں جگر گوشے ہیں

ایک غُدّہ ہوتا ہے جس کا نام "پانقراس" ہے۔ انگریزوں نے اس کا نام "پانکریئس" رکھا ہے۔ جب اس پانقراس کا فعل خراب ہو جاتا ہے تو پھر یہ جسم میں شکر ہضم کرنے اور کنٹرول کرنے کا کام نہیں کر سکتا۔ اس مرض کا اکثر و بیش تر سبب غذائی بے اعتدالیاں ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ مرض پیدائشی (موروثی) بھی ہو سکتا ہے۔ ماں باپ کو ہو تو اولاد کو کسی بھی عمر میں ہو سکتا ہے۔ شکر بالکل چھوڑ دینی چاہیے۔ ان نشاستہ والی غذاؤں سے بھی جو آخر جسم میں شکر بن جاتی ہیں پرہیز کرنا ہی ہوگا۔ پروٹین دار غذائیں زیادہ اچھی رہتی ہیں۔

بھولنے کی عادت

س: میں امتحان کے لیے جو کچھ یاد کرتا ہوں اکثر امتحان دیتے وقت سب ذہن سے نکل جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شہزاد اقبال، کراچی

ج: اس صورتِ حال کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، مگر سب سے بڑا سبب "خوف" ہے۔ اَن جانا خوف! اور خوف اس لیے غالب آتا ہے کہ انسان خود اعتماد نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو یہ اعتماد ہو کہ جو آپ نے پڑھا ہے وہ آپ کا ہے تو جو چیز آپ کی ہو گئی وہ آپ سے باہر کیسے جا سکتی ہے۔

جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارے ایک دوست چوتھے سال میں پانچ سال فیل ہوتے رہے۔ خوب سمجھ دار انسان تھے۔ اب بھی دہلی میں زندہ ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ اگر پاس ہو گیا تو کالج پھر کیسے آؤں گا۔ یہاں کا مزہ پھر کہاں آئے گا۔ تو دیکھ لیا آپ نے! یہ بھی ایک سبب ہے۔

فلو

س: فُلو کس بیماری کو کہتے ہیں اور یہ کس طرح واقع ہوتی ہے اور اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ عبدالرزاق انصاری، کراچی

ج: ایسا نزلہ زکام (حاد) جس میں ناک بند ہو جائے یا بہ نکلے اس کا جدید نام انفلوئنزا ہے، جو وبائی بھی ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے الفاظ کی کفایت کی خاطر انفلوئنزا کو فلو کہنا شروع کر دیا ہے اور اب تو یہ ہو گیا ہے کہ جہاں نزلہ، زکام ہوا بس فُلو کہا جانے لگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نزلہ، زکام میں جراثیم کا اثر ہوتا ہے۔ اگر یہ جراثیم مضبوط قسم کے ہوں تو ایک سے

دوسرے کو بھی لگ جاتے ہیں، وبا بھی پھیل جاتی ہے۔

سرطان

س: کینسر کیسے ہوتا ہے۔ اس کی کیا علامات ہیں؟ سجاد جیب، فیصل آباد

ج: او ہو، آپ بچے تو بڑے بڑوں کو امتحان میں ڈال دیتے ہیں۔ اب یہ سرطان یا کینسر ایک تو رہا نہیں ہے۔ جگہ جگہ کا کینسر اپنا اپنا الگ مقام رکھتا ہے اور ہر مقام کے سرطان کی الگ الگ علامت ہوتی ہے۔ مختصراً یہ بات سمجھ لینا کافی ہے کہ نامعلوم اسباب کی وجہ سے جسم کے خلیات (سیلز) کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے اور خلیات کی تباہی، بربادی کو روکنے کا فن انسان کو اب تک معلوم نہیں ہے۔ اس لیے اب تک یہ موذی ناقابلِ علاج ہے۔

سینے میں درد

س: میری عمر ۱۱ سال ہے۔ میں بہت کم زور ہوں۔ تھوڑا سا چل پھر لوں تو سانس پھول جاتا ہے۔ سینے میں اکثر بائیں طرف درد رہتا ہے۔ ازراہِ کرم علاج بتائیے۔

ارشاد احمد، کراچی

ج: میری عمر ۱۲ سال ہے۔ میں تھوڑا سا دوڑتا ہوں تو میرا سانس پھولنے لگتا ہے اور کام کرنے سے بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ازراہِ کرم کوئی علاج بتائیں۔ امتیاز احمد خان، کراچی

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بچپن (ابتدائی عمر) میں موتی جھرا ہوا ہو اور اس کا صحیح علاج نہ ہوا ہو اور دل میں کوئی ڈوری (صمام) کم زور پڑ گئی ہو۔ ممکن ہے کہ جوڑوں کا درد ہو گیا ہو۔ اس سے بھی قلب کو نقصان پہنچتا ہے۔

یہ سانس پھولنا کم زور قلب کی علامت ہے۔ اچھے معالج سے رجوع کرنا چاہیے تاکہ تشخیص صحیح ہو سکے۔

کالم طلب کی روشنی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ آنے والے بے شمار خطوط سے ہو رہا ہے۔ اکثر نونہال اس قسم کے سوالات بھیج رہے ہیں جن کے جواب رسالے میں شائع نہیں کیے جا سکتے۔ ایسے نونہالوں کو چاہیے کہ وہ اپنا مکمل پتا ضرور لکھیں تاکہ انھیں خط کے ذریعہ سے ضروری مشورہ دیا جا سکے۔ مطب ہمدرد کے ماہر اطبا کسی معاوضے کے بغیر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ جو نونہال اپنے سوالات کے جلد جوابات چاہتے ہیں وہ بھی اپنا پتا ضرور لکھیں۔ اگر آپ رسالے میں جواب چاہتے ہیں تب بھی اپنا پتا ضرور لکھیے۔

قائم شدہ ۱۹۴۱

ہم ان کے درخشاں مستقبل کے خواہاں ہیں!

جیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک، جدید بینک ملک کے اندر ۱۸۰۰ سے زیادہ اور بیرون ملک ۶۸ شاخوں، ۱۶۰۰ سے زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات، نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔

ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں کا خصوصی شعبہ بچوں اور طالب علموں میں بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل ہے۔

حبیب بینک ملک کی ترقی وخوشحالی کے لئے نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (I)/HBL/80/ 1 U

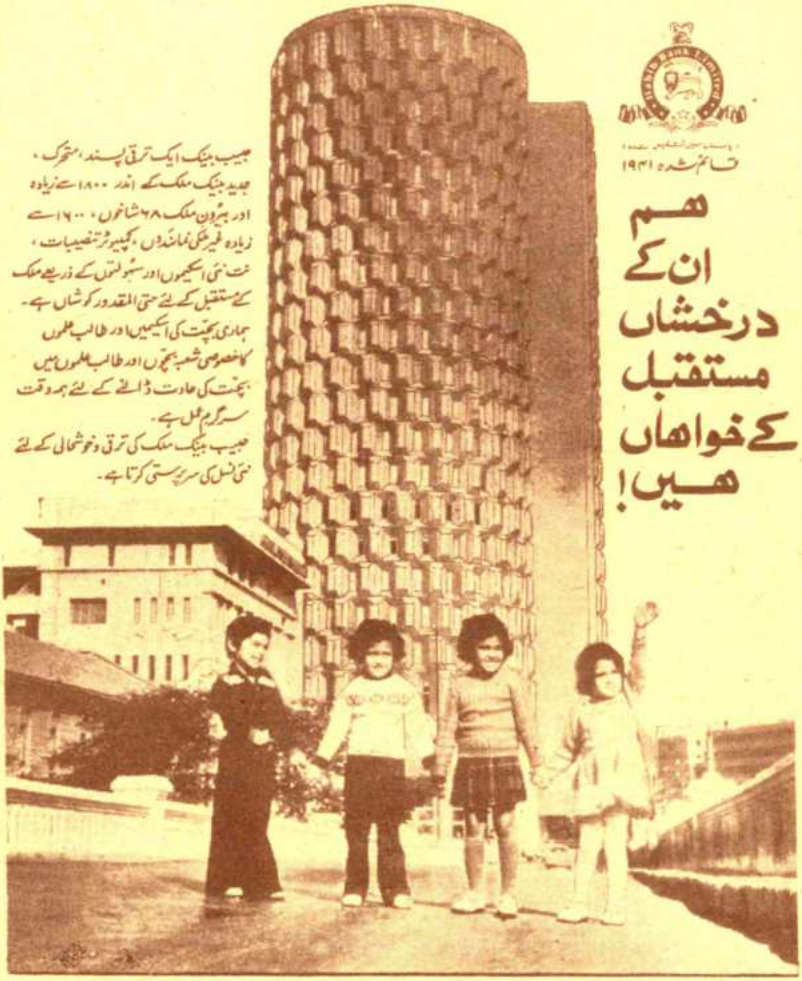

manhattan international

مرزا کے جوتے

وقار محسن

نام تو ان کا مرزا حلیم بیگ تھا، لیکن وہ اپنے تخلص سے زیادہ یاد کیے جاتے تھے۔ سرخ مخمل کی ٹوپی جس کے کنارے پسینے اور تیل سے بھیگ کر کالے پڑ گئے تھے ہر وقت مرزا کے سر پر جمی رہتی۔ شیروانی کے بٹن ہمیشہ کھلے رہتے اور جب بھی مرزا شیروانی کے دامن پھڑپھڑاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے گلی میں داخل ہوتے تو ایسا لگتا کہ کوئی ہیلی کوپٹر اُتر رہا ہے۔

مرزا کی ٹوپی اور شیروانی کی طرح ان کے جوتے بھی محلّے بھر میں مشہور تھے۔ مشہور تھا کہ ۳۲ سال

پیش تر یہ تاریخی جوتے مرزا کو جہیز میں ملے تھے۔ کسی زمانے میں یہ براؤن رہے ہوں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ ڈارک براؤن سے کالے میں تبدیل ہو گئے۔ مرزا کے جوتے نہ صرف اپنے غیر معمولی سائز کی وجہ سے بلکہ اس موسیقی کی وجہ سے بھی مشہور تھے جو ان میں سے خارج ہوتی رہتی اور دور سے مرزا کی آمد کا اعلان کرتی۔

مرزا کی بیگم اکثر خوشامدیں کرتیں کہ مرزا جوتا بدل لیں، لیکن مرزا ہرگز راضی نہ ہوتے۔ جب بھی جوتا کسی جگہ سے مسکراتا مرزا اسے کالو چمار کے پاس لے جاتے۔ پچھلے ہفتے کالو نے بھی صاف جواب دے دیا تھا، کیوں کہ اب چمڑے میں دھاگا پکڑنے کی طاقت ختم ہو گئی تھی۔ ایک دن جب مرزا غسل فرما رہے تھے ان کی بیگم نے جوتے اُٹھا کر گلی کے پیچھے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیے۔ مرزا کو جوتے کی جدائی کا افسوس تو بہت ہوا، لیکن چوں کہ اب جوتے کا تلا بھی چھلنی ہو گیا تھا اس لیے مرزا نے صبر کر لیا۔

اگلی صبح جب مرزا دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو دیکھا کہ ان کا پالتو کُتّا موتی ان کے جوتے منھ میں دبائے دروازے پر بیٹھا تھا۔ موتی نے سونگھ کر ہی مرزا کے جوتوں کو پہچان لیا تھا اور وفاداری کے ثبوت میں کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا لایا تھا۔ بیگم کے اصرار پر مرزا نے جوتوں کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹا اور دفتر جاتے ہوئے بس کی کھڑکی سے تین ہٹی کے پل سے نیچے پھینک دیا۔ تین ہٹی کے پُل کے نیچے کچھ بچے بڑے بڑے تھیلے لیے کاغذ، ٹین اور لوہا جمع کر رہے تھے۔ ایک بچے نے مرزا کے جوتے مع اخبار کے اپنے تھیلے میں ڈال لیے۔ واپسی پر جب ان بچوں نے کچرے کی چھٹائی کی تو جوتوں کو سڑک پر پھینک دیا۔ رات کو جب مرزا کے ایک شاگرد دُلارے میاں سیکنڈ شو دیکھ کر لوٹ رہے تھے تو انھیں موٹر سائکل کی روشنی میں مرزا کے جوتے نظر آئے۔ دُلارے نے فوراً جوتے اُٹھا کر احتیاط سے کیریئر میں داب لیے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے جب مرزا کے گھر کی گھنٹی بجی۔ مرزا بڑبڑاتے ہوئے نیچے اُترے اور جب دُلارے نے احتیاط سے جوتے کیریئر سے نکال کر مرزا صاحب کو پیش کیے تو مرزا صاحب کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ ڈالیں۔

اگلے دن جب مرزا جوتوں کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ بشیر دھوبی آگیا اور خوشامد کرنے لگا کہ جوتے پھینکنے کے بجائے اس کو دے دیے جائیں مرزا صاحب

نے سوچا کہ اچھا ہے جوتوں سے بیچا بھی چھوٹ جائے گا اور کارِ ثواب بھی ہو گا۔ بشیر دھوبی نے گھر جا کر پہلے تو جوتوں کی مرہم پٹی اور پھر پالش کی ایک پوری ڈبیا اس پر مَسل ڈالی۔ عشا کی نماز کے وقت مسجد میں چوری کے ڈر سے بشیر دھوبی نے جوتے اُٹھا کر اپنے قریب رکھ لیے اور جب نماز ختم ہونے پر وہ جوتے بغل میں دبائے مسجد سے نکلا تو مولوی تبارک علی نے مرزا کے جوتے فوراً پہچان لیے اور "چور، چور" کا اعلان کر کے لوگوں کو جمع کر لیا۔ بشیر نے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے اور جوتوں سے متعلق کہانی دُہرائی، لیکن کسی نے یقین نہیں کیا۔ محلّے کے چند بزرگ جب جوتے لے کر مرزا کے گھر پہنچے تو مرزا سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ مرزا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور مجمع کو دیکھ کر سمجھے کہ کسی مشاعرے کا بُلاوا آیا ہے۔ خوشی خوشی نیچے اُترے، لیکن جب مولوی تبارک علی نے اخبار میں لپٹے جوتے نہایت ادب سے ان کو پیش کیے تو مرزا کا دِل چاہا کہ وہ ابھی جا کر تیسری منزل سے چھلانگ لگا دیں۔

اگلے دن جمعے کی چھٹی تھی۔ مرزا صبح سویرے اپنے تاریخی جوتے بغل میں دبا کر نکل گئے۔ بس پکڑ کر ٹاور پہنچے اور وہاں سے ہاکس بے کا رُخ کیا۔ جوتوں کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر کے مرزا نے اطمینان کا سانس لیا۔ شام تک گھر واپس آئے۔ تھک کر چور ہو گئے تھے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔ رات کے گیارہ بجے گھنٹی بجی۔ مرزا کی بیگم نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو دروازے پہ ایک ہجوم نظر آیا۔ ہوا یوں تھا کہ آج جمعہ کی چھٹی تھی اور محلّے کے لڑکے پک نک منانے ہاکس بے گئے ہوئے تھے۔ سمندر کے کنارے نہاتے ہوئے ایک لڑکے کو ریت پر مرزا کے جوتے نظر آئے۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ مرزا نے اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے خودکشی کر لی ہے۔ سب لڑکے بے حد اداس تھے کہ مرزا کے دَم سے محلّے کی رونق تھی۔ پہلے تو انھوں نے سمندر کے کنارے مرزا کی ٹوپی اور شیروانی تلاش کی اور پھر نا اُمید ہو کر مرزا کے جوتے ایک تولیے میں لپیٹ کر واپس آ گئے۔ مرزا کے انتقال کی خبر محلّے میں آگ کی طرح پھیل گئی اور اب لوگ پُرسے کے لیے نیچے جمع تھے۔

مجمع کو دیکھ کر مرزا کی بیگم نے سوچا کہ شاید لوگ مرزا کو کونسلر بنانے پر راضی ہو گئے ہیں۔ بیگم مرزا نے خوشی خوشی لوگوں کو اوپر بلا کر کمرے میں بٹھایا اور چائے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ مولوی تبارک علی صاحب نے پردے کے پیچھے مرزا صاحب کی بیگم کی آہٹ سُن کر کہا:

"نہایت افسوس ہے مرزا صاحب جو پورے محلے کی جان تھے ہم لوگوں کو تنہا چھوڑ گئے۔"
ایک اور بزرگ فرمانے لگے :
"اللہ تعالیٰ ان کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"
ابھی بیگم حیرت سے لوگوں کی باتیں سُن رہی تھیں کہ مرزا صاحب کی آنکھ کھل گئی اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے کمرے میں آگئے۔ مرزا صاحب کو دیکھ کر سب لوگوں کے منھ سے بے ساختہ نکلا، "ارے! مرزا صاحب آپ۔"
پہلے تو مرزا صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، لیکن جب میز پر رکھے جوتوں پر نظر پڑی تو وہ غصّے سے پاگل ہو گئے اور اپنی مخمل کی سرخ ٹوپی اُتار کر جوتوں سے اپنے سَر کو پیٹ ڈالا۔

غذائیں دوائیں

ہم میں سے اکثر یہ نہیں جانتے کہ پیاز ایک اعلا درجے کی جراثیم کُش دوا ہے۔ لہسن سے بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) کم ہوتا ہے۔ مولی یرقان کا ایک علاج ہے۔ شہتوت گلے کی تکلیف بھی دُور کرتے ہیں۔ نیم بہترین اینٹی سیپٹک اور مصفیِ خون ہے۔ آملہ وٹامن سی سے بھرپور ہے۔ اَڑوسا پھیپڑوں کا ٹانک ہے وغیرہ۔

ہم جتنی سبزیاں، دالیں اور پھل استعمال کرتے ہیں اور اپنے اِرد گرد جو پودے اور درخت دیکھتے ہیں، قدرت نے ان میں ایسی دوائی اور شفائی اثرات رکھے ہیں کہ اگر ہم اُن کا بَروقت مناسب استعمال کریں تو بے شمار پریشانیوں اور اخراجات سے بچ سکتے ہیں۔
اس کتاب میں تقریباً پچاس سبزیوں، پھلوں اور عام جڑی بوٹیوں کے خواص، فائدے اور استعمال دیے گئے ہیں۔
سب کے لیے ایک مفید کتاب۔

قیمت: ۵/= رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸

ویسٹ انڈیز کرکٹ ٹیم جو پاکستان آ رہی ہے

ساجد علی ساجد

بزرگوں کا کہنا ہے کہ اپنے دشمنوں کو پہچانیے اور جانیے۔ کرکٹ میں ویسٹ انڈیز ہماری دشمن نہ سہی مخالف ٹیم ضرور ہے لہٰذا جی چاہتا ہے کہ اس مرتبہ آپ کو کرکٹ کی اس سُپر پاور (بڑی طاقت) کے بارے میں بتایا جائے جو پاکستان آ کر ہماری کرکٹ ٹیم پر حملہ آور ہونے والی ہے۔

پرانے زمانے میں مائیں بچّوں کو خوف ناک دیو اور جن بھوتوں سے ڈرایا کرتی تھیں۔ آج کے کرکٹ کے کھلاڑیوں کو لوگ ویسٹ انڈیز سے ڈراتے ہیں کہ اچھا نہیں کھیلو گے تو ویسٹ انڈیز کو بُلا لیں گے۔ ویسٹ انڈیز کو اتنا خوف ناک اس کے فاسٹ بالروں نے بنایا ہے جن کی گیندیں بجلی کی سی تیز رفتار سے بیٹس مینوں کی طرف آتی ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے بیٹس مین ویسٹ انڈیز کے ان برق رفتار بولروں سے کھیلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ان بولروں کے قد لمبے، حُلیہ متاثر کرنے والا اور ان کی پھینکی ہوئی گیندیں ایسی ہوتی ہیں جیسے بجلی کوند رہی ہو۔ ان بولروں میں مائیکل ہولڈنگ میلکم مارشل، کولن کرافٹ، جوئیل گارنر اور پیٹرک پیٹرسن شامل ہیں۔ ان میں سے چار ایک ساتھ کھیلتے ہیں اور ایک ذرا تھکتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ بولنگ کے لیے آجاتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ ویسٹ انڈیز کے پاس صرف بولر ہی ہیں، اس کے پاس دنیا کے بہترین بیٹس مین بھی ہیں۔ ان میں کپتان ویو رچرڈز ہیں جن کو ساری دنیا جانتی ہے۔ ان کے علاوہ گورڈن گرینج، ڈوجون اور گومز ہیں۔ اپنے بولروں کی طرح یہ بیٹس مین بھی جارحانہ انداز سے کھیلتے ہیں۔ پھر ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی چاہے وہ بیٹس مین ہوں یا بولر، جب فیلڈنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑے غضب کی فیلڈنگ کرتے ہیں۔

اگرچہ ویسٹ انڈیز کی ٹیم بہت طاقت ور ہے، مگر پاکستان کے پاس بھی ایسے کھلاڑی ہیں

جو ویسٹ انڈیز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں عمران خاں، وسیم اکرم اور عبدالقادر جیسے تیز اور پُر فریب گیند پھینکنے والے بولر بھی شامل ہیں اور جاوید میانداد، محسن خاں، مدثر نذر، قاسم عمر، سلیم ملک، شعیب محمد اور رمیز راجا جیسے بیٹس مین بھی ہیں۔ یہ ایسے کھلاڑی ہیں جن کی موجودگی میں ویسٹ انڈیز کے خلاف مقابلے ہرگز یک طرفہ نہیں ہوں گے۔

ویسٹ انڈیز کی کارکردگی

یہاں ہم پاکستان کے خلاف ویسٹ انڈیز کی کارکردگی کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہیں گے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم سب سے پہلے ۵۸-۱۹۵۷ء میں ویسٹ انڈیز گئی تھی۔ اس دورے سے دونوں ملکوں کے کرکٹ کے تعلقات کی ابتدا ہوئی تھی۔ اُس وقت دونوں ٹیموں نے پانچ ٹیسٹ کھیلے جن میں سے تین ویسٹ انڈیز نے جیتے۔ ایک میں پاکستان کی جیت ہوئی اور ایک ٹیسٹ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گیا۔ یہ پاکستان کے خلاف ویسٹ انڈیز کی پہلی کامیابی تھی۔

اس کے بعد ۵۹-۱۹۵۸ء میں ویسٹ انڈیز جواب میں پاکستان کے دورے پر آئی اور اس نے یہاں تین ٹیسٹ کھیلے۔ ان میں سے دو پاکستان نے جیتے۔ ایک میں ویسٹ انڈیز کامیاب ہوئی۔ اس طرح پاکستان نے ویسٹ انڈیز کے خلاف سیریز کی اکلوتی فتح حاصل کر لی، کیوں کہ اس کے بعد سے پاکستان ٹیسٹ سیریز میں ویسٹ انڈیز کو کبھی نہیں ہرا سکا۔ ۵۹-۱۹۵۸ء کی اس سیریز میں ہارنے کا ویسٹ انڈیز کو ایسا دکھ ہوا کہ وہ پاکستان کے مقابلے پر ہی نہیں آئی اور تقریباً سولہ سال تک ٹیسٹ سیریز میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کا آمنا سامنا نہیں ہو سکا۔

۷۵-۱۹۷۴ء میں ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم دو ٹیسٹ میچوں کی مختصر سیریز کھیلنے پاکستان آئی، لیکن یہ دونوں میچ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں پاکستانی ٹیم نے مشتاق محمد کی قیادت میں ویسٹ انڈیز کا دورہ کیا، لیکن پاکستان کی ٹیم پانچ ٹیسٹ میچوں کی یہ سیریز سخت مقابلے کے بعد ۱-۲ سے ہار گئی۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں ویسٹ انڈیز چار ٹیسٹ میچوں کی سیریز کھیلنے پاکستان آئی۔ نسبتاً سُست

رفتار دکھائی بنواتے کے باوجود پاکستان فیصل آباد ٹیسٹ میں ہارنے کی وجہ سے یہ سیریز ہار گیا جب کہ باقی تین میچ ڈرا ہو گئے تھے۔

اس طرح مجموعی طور پر اب تک پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان ۱۹ ٹیسٹ کھیلے جا چکے ہیں، جن میں سے ویسٹ انڈیز نے سات میچ جیتے، چار میچوں میں پاکستان کو شکست ہوئی جب کہ آٹھ ٹیسٹ میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گئے۔ مختلف ملکوں کے درمیان ٹیسٹ میچوں میں ویسٹ انڈیز کی کارکردگی کا اندازہ مندرجہ ذیل نقشے سے کیا جا سکتا ہے:۔

بہ مقابلہ	میچ کھیلے	جیتے	ہارے	فیصلہ نہیں ہوا
انگلینڈ	۹۰	۳۵	۲۱	۳۴
اوسٹریلیا	۶۲	۱۹	۲۷	۱۶
نیوزی لینڈ	۲۱	۷	۳	۱۱
بھارت	۵۴	۲۲	۵	۲۷
پاکستان	۱۹	۷	۴	۸
مجموعی کارکردگی	۲۴۶	۹۰	۶۰	۹۶

کراچی میں ہمدرد کی کتابیں

ہمدرد سینٹر ناظم آباد کے علاوہ ان دکانوں سے بھی ملتی ہیں۔

- طاہر بک ڈپو، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- البدر بک کارپوریشن، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- کراچی بک ڈپو، اردو بازار
- البلال بک سینٹر، اردو بازار
- علمی کتاب گھر، اردو بازار
- مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم۔ اے جناح روڈ
- السجاد اسٹیشنرز، نزد پاپوش ریلوے کراسنگ، ناظم آباد

تِتلی

اُفق دہلوی

پھولوں پر ہے اُڑتی پھرتی — اِک ننھی سی سنہری تتلی
اِک بچّہ بھی تتلی جیسا — گھات میں تتلی کے ہے بیٹھا
جونہی بیٹھتی ہے پھولوں پر — بچّہ پہنچ جاتا ہے لپک کر
آہٹ پاکر اُڑ جاتی ہے — اوپر نیچے بَل کھاتی ہے
ابھی اِدھر تھی ابھی اُدھر ہے — پھولوں پر ہی گزر بسر ہے
خوش بُو کی دیوانی تتلی — پھولوں کی ہے رانی تتلی
مالک نے کیا چیز بنائی — اس کی کیا پوشاک سجائی
پھولوں پر لگتی ہے اچھّی — جیسے بُلبل پھرے چہکتی
بچّے کو یُوں بہلاتی ہے — چاہے پکڑنا اُڑ جاتی ہے
جانے دو تتلی کو نہ پکڑو — اس کو پھولوں پر رہنے دو
ہاتھ میں آئی تو مَر جائے گی — پھولوں سے دل بہلائے گی

دیر ہوئی اسکول کو جاؤ
تم ہی اُفق اس کو سمجھاؤ

ثمینہ اور اس کا پھول

میرزا ادیب

ثمینہ کو اپنے باغ سے بڑا پیار تھا۔ اس نے اپنے اس باغ میں رنگا رنگ پھولوں کے پودے لگوا رکھے تھے۔ ان پودوں کی بڑی محبت سے پرورش کرتی تھی اور ان کی شاخوں پر خوب صورت پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جولائی کی ایک رات کو بڑے زور کی ہوا چلی۔ ایسی تند و تیز ہوا کہ کچے مکانوں کی چھتیں اُڑ گئیں۔ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے کئی پرانے درخت گر کر زمین سے جا لگے۔ ادھر ثمینہ کا باغ بھی اُجڑ کر رہ گیا۔ پودا اور درخت تو کوئی نہ گرا مگر باغ میں سوائے

پری نے ثمینہ سے کہا "اچھی لڑکی ذرا میری طرف دیکھو"

ایک کے سارے کے سارے پھول شاخوں سے ٹوٹ کر گھاس کے اوپر بکھر گئے۔

یہ پھول جو سلامت رہا تھا گلاب تھا جو عام پھولوں سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوب صورت بھی تھا۔ ثمینہ کو یہ پھول دل و جان سے پیارا تھا۔ صبح اسکول جاتی تو اس پھول کو دیکھ کر جاتی، دوپہر واپس گھر آتی تو اسے دیکھنے کے لیے ضرور باغ میں جاتی اور شام کے وقت اسکول اور گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اس پودے کے پاس کچھ دیر بیٹھی رہتی جس کی ایک شاخ پر یہ پھول اپنی بہار دکھاتا تھا۔

ایک شام جب وہ معمول کے مطابق پودے کے پاس بیٹھی تھی اور بار بار پھول کو دیکھتی تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے پودے سے کچھ دور ایک درخت کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم جانا اور وہ گیت گنگنانے لگی جو وہ تنہائی کی ان گھڑیوں میں اکثر گنگنایا کرتی تھی۔ یکایک اس کی نظر درخت کے پیچھے جا پڑی۔ اسے پھر احساس ہوا کہ وہاں کوئی ہے جو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ "یہ کون ہو سکتا ہے۔ باغ کا دروازہ بند ہے۔ ادھر کوئی آ ہی نہیں سکتا۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا، مگر اس کا دل کہتا تھا کہ وہاں ضرور کوئی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ چل کر اُدھر جاتے ایک آواز اس کے کان میں آئی، "اچھی لڑکی! ذرا میری طرف دیکھو۔" ثمینہ نے سامنے دیکھا۔ ایک پری کھڑی تھی۔

"آپ؟ کون ہیں آپ؟"

"آپ نے میرے پروں کو دیکھ کر سمجھ لیا ہوگا کہ میں ایک پری ہوں۔"

"ہاں وہ تو میں نے سمجھ لیا ہے۔ یہاں میرے باغ میں آپ کا کیا کام؟"

پری مسکرائی، "کام ہے اچھی لڑکی، کیا آپ اجازت دیں گی کہ آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟"

ثمینہ نے اسے اشارے سے بیٹھ جانے کے لیے کہا اور خود بھی وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔

"اچھی لڑکی...!" پری فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ ثمینہ جھٹ بول اٹھی۔ "میرا نام ثمینہ ہے۔"

"شکریہ ثمینہ بہن۔"

ثمینہ کو اس کے الفاظ سن کر حیرت ہوئی کہ وہ اسے کیوں بہن کہہ رہی ہے۔ ایک پری کو انسان کے بچے سے کیا تعلق، لیکن وہ خاموش رہی۔

"آپ کو یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ میں آپ کے باغ میں کیوں آتی ہوں۔ ثمینہ بہن اس کی ایک وجہ ہے۔ میں آپ کو پورا واقعہ سناتی ہوں جس سے آپ سمجھ جائیں گی کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں۔"

"سنائیے۔" ثمینہ بولی۔

وہ کہنے لگی، "یہ تو آپ جانتی ہیں کہ پریاں پرستان میں رہتی ہیں۔ ان کی دنیا آپ کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہماری ایک شہزادی بھی ہوتی ہے جس کا ہر حکم ہر پری مانتی ہے۔ کبھی کسی پری نے اس کا حکم ماننے سے انکار نہیں کیا۔ ہمارے ہاں ماحول بڑا پُرسکون ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ شہزادی ہم سے بہت خوش ہے اور ہم سب پریاں اپنی شہزادی کی بڑی عزت کرتی ہیں۔"

ثمینہ جو اس کی بات غور سے سُن رہی تھی۔ بولی، "آپ واقعہ بتائیں۔"

"بتاتی ہوں اچھی لڑکی۔ نہ نہ ثمینہ بہن۔" ثمینہ ہنس پڑی، "ہاں تو کیسے ہوا کیا ہے؟"

ثمینہ کی امی نے کہا، "تم نے پری کو پھول نہ دے کر اچھا نہیں کیا۔"

پری اس کے اور قریب ہو گئی۔ "پرستان میں ہماری شہزادی کبھی کبھی ساری پریوں کو اپنے محل میں بُلا لیتی ہے۔ وہاں شان دار جشن ہوتا ہے۔ کوئی پری بھی اس جشن سے غیر حاضر نہیں رہتی۔ ہر پری کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس جشن میں شریک ہو کر اپنی شہزادی کو دیکھے اور اس سے باتیں کرے۔ اس روز ہماری شہزادی بہت خوش دکھائی دیتی ہے ہر ایک کے ساتھ بڑی خوشی سے باتیں کرتی ہے۔ پچھلی مرتبہ ایسا جشن ہوا تو ساری پریاں اس میں شریک ہوئیں۔ شہزادی نے سب سے باتیں کیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میری چھوٹی بہن شہزادی کے باغ کی سیر کرتی پھری۔ شہزادی کے پاس نہ آسکی۔ شہزادی نے اس سے باتیں نہ کیں۔ اس میں بھلا شہزادی کا کیا قصور تھا؟"

ثمینہ نے فوراً کہا، "کوئی قصور نہ تھا۔ بلکہ قصور آپ کی بہن کا تھا۔ وہ شہزادی کے پاس گئی کیوں نہیں تھی؟"

"بالکل درست۔" پری بولی، "مگر میری بہن ناراض ہو گئی۔ غصّے سے بولی، شہزادی نے مجھے بلوایا کیوں نہیں تھا۔ آئندہ جشن ہو گا تو میں اس میں شامل نہیں ہوں گی۔"

"اچھا یہ کہا اس نے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"یہی بات کہی۔ ہم نے سوچا۔ یونہی غصّے میں یہ بات کہہ رہی ہے۔ بھلا جشن میں کیوں نہیں جائیں گی مگر بدقسمتی سے اس نے ضد کی، ہم میں سے کسی کی نہ سُنی اور دو روز پہلے جو جشن ہوا اس میں شامل نہ ہوئی۔ شہزادی کو یہ خبر مل گئی کہ ایک پری جان بوجھ کر جشن میں نہیں آئی۔ اس نے اسے فوراً اپنے ہاں بُلایا اور نافرمانی کی یہ سزا دی کہ ساری رات وہ محل کے باغ میں رہے۔ کوئی بھی اس سے ملنے نہ جائے اور نہ وہ باغ سے باہر نکلے۔

"یہ سزا دی شہزادی نے؟"

"جی ہاں اب میری بہن نے یہ سمجھا کہ کیا ہے رات باغ میں گھوم پھر کر گزار لوں گی۔ یہ سزا تو کوئی سزا ہے نہیں۔ تو وہ شہزادی کے حکم کے مطابق اس کے باغ میں چلی گئی۔ رات بیتی تو میں اور میرے ساتھ میری امی اور میری دوسری بہنیں وہاں گئیں اور یہ دیکھ کر ہمیں سخت دکھ ہوا کہ اس کے پَر جھڑ گئے تھے اور وہ بغیر پَروں کے رہ گئی تھی۔"

"ایسا کیوں ہوا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

پری نے جواب دیا، "وہاں آدھی رات کے بعد اوس پڑی۔ یہ اوس بڑی خطرناک تھی۔ اس کے اثر سے میری بہن کے پر جھڑ گئے اور وہ اڑنے کے قابل نہ رہی۔ ہم پریاں شہزادی کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس کی بڑی منت سماجت کی کہ اسے معاف کر دے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی پھر کہنے لگی، اگر انسانوں کی دنیا میں ایک ایسا باغ ہو جس میں صرف ایک ہی پھول ہو اور یہ پھول اس کے بازوؤں سے لگایا جائے تو اس کے پر دوبارہ لگ جائیں گے۔"

ثمینہ سمجھ گئی کہ وہ کیوں اس کے باغ میں آئی ہے، "نہیں نہیں۔ میں ہرگز ہرگز اپنا پھول نہیں دوں گی۔ مجھے یہ بہت ہی عزیز ہے۔"

پری بولی، "ثمینہ بہن کیا آپ کو اس پری سے ہمدردی نہیں ہے جو اپنے پروں سے محروم ہو گئی ہے؟"

"ہمدردی ضرور ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"تو پھر مجھے اجازت دیں کہ یہ پھول لے جاؤں۔ اس سے میری بد نصیب بہن کے پر لگ جائیں گے۔"

"میں پھول نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں دے سکتی۔" ثمینہ کا اٹل فیصلہ تھا۔ پری نے اس سے بار بار التجا کی، لیکن وہ نہ مانی۔ ناچار پری چلی گئی۔ ثمینہ خوش تھی کہ اس کا پھول سلامت ہے اور سارے باغ کی رونق بنا ہوا ہے۔

ایک دن ثمینہ اسکول سے آئی تو اس کا بدن خاصا گرم تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس کا بخار بڑا تیز ہو گیا۔ معالج نے آکر دیکھا۔ دوا دی اور چلا گیا۔ رات بھر ثمینہ کی حالت خراب رہی۔ صبح کچھ فرق پڑا۔

ثمینہ نے دیکھا کہ اس کی سہیلی رفیعہ اس کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھی ہے۔

"رفیعہ!"

"ہاں ثمینہ طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

اب تو ٹھیک لگتی ہے!"

چار دن کے بعد ثمینہ صحت یاب ہو گئی۔ اس کی امی نے اسے بتایا، "ثمینہ! تمہیں خبر ہے

پہلی رات جب تمھاری طبیعت زیادہ خراب تھی رفیعہ ساری رات تمھارے پاس بیٹھی رہی تھی۔ وہی تمھیں دوا پلاتی رہی ہے۔ تم نیم بے ہوش تھیں۔ پھر اس کے بعد وہی زیادہ تر تمھاری تیمار داری کرتی رہی ہے۔"

یہ سن کر ثمینہ بولی، "امی آپ اسے گھر بھیج دیتیں۔"

"میں نے بہت کہا تھا۔ چلی جاؤ بیٹی! ہم سب ثمینہ کی تیمار داری کے لیے کافی ہیں، مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔ اب جب تم ٹھیک ہو گئی ہو تو میرے اصرار پر گھر گئی ہے۔" ثمینہ رفیعہ کا انتظار کرنے لگی۔ دوپہر کے بعد وہ آئی تو ثمینہ نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

رفیعہ بولی، "شکریہ کیسا! یہ فرض تھا میرا۔ تمھاری سہیلی ہوں۔ تکلیف کے وقت کام نہیں آؤں گی تو کب آؤں گی۔"

تھوڑی دیر بعد رفیعہ نے دیکھا کہ اس کی سہیلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

"کیوں ثمینہ! کیا ہوا۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"کوئی تکلیف نہیں۔"

"پھر تمھاری آنکھوں میں آنسو کیسے! بتاؤ نا، ثمینہ بتا بھی دو۔"

ثمینہ نے اسے پری کا سارا واقعہ بتا دیا۔ ثمینہ کی امی نے بھی وہ واقعہ سن لیا تھا، کیوں کہ جب ثمینہ اپنی سہیلی کو وہ باتیں بتا رہی تھی تو اس کی امی قریب ہی بیٹھی ہوئی کوئی کام کر رہی تھیں۔ ساری باتیں سُن کر کہنے لگیں:

"ثمینہ بیٹی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا تھا جو پری کو پھول دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بیٹی! مصیبت میں دوسروں کے کام آنا تو ہر انسان کا فرض ہے۔"

"امی! یہی سوچ کر مجھے دکھ ہوا ہے۔"

اس شام ثمینہ اپنے باغ میں گئی تو پری درخت کے نیچے بڑی اداس اور افسردہ بیٹھی تھی۔ ثمینہ کو دیکھ کر کہنے لگی، "بہن! روز تمھارا انتظار کرتی ہوں۔ آج کئی دن کے بعد آئی ہو۔ بہن! کیا آج بھی مجھے مایوس کر دو گی؟"

ثمینہ نے منھ سے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ بڑھا کر پھول توڑا اور پری کے حوالے کر دیا۔ پری کو اتنی خوشی ہوئی، اتنی خوشی ہوئی کہ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔

سارس بادشاہ

ڈاکٹر شمیم حنفی

بہت دن پہلے کی بات ہے، ایک روز بغداد کے خلیفہ ہارون رشید تیسرے پہر کے وقت دیوان پر مسند سے ٹیک لگائے آرام کر رہے تھے۔ دن بھر کے کام کاج نے انھیں تھکا ڈالا تھا۔ اس وقت وہ قہوے کی چسکیوں کے ساتھ حقّے کے کش لگا رہے تھے۔ ان کا وزیرِ اعظم منصور روزانہ اسی وقت ان سے ملاقات کے لیے آتا تھا۔ آج جب وہ آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ خلیفہ نے حقّے کی نَے الگ کرتے ہوئے پوچھا،

"کیا بات ہے منصور؟ تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

وزیر نے دھیمے لہجے میں کہا، "حضور! مجھے پتا نہ تھا کہ چہرے سے آپ میرے دل کا حال جان جائیں گے۔ بات کوئی خاص نہیں۔ محل کے باہر ایک سوداگر کچھ بہت خوب صورت چیزیں بیچ رہا ہے۔ میں ان میں سے ایک آدھ خریدنا چاہتا تھا، لیکن اس وقت میری جیب بالکل خالی ہے۔"

خلیفہ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ باہر جا کر سوداگر کو بُلا لائے۔ سوداگر چند لمحوں کے بعد اندر آیا۔ وہ ایک ٹھنگنے قد کا موٹا سا آدمی تھا۔ اس کا لباس بہت معمولی اور پرانا تھا۔ اس نے کچھ انگوٹھیاں، جواہرات، جڑاؤ طشتریاں، خوب صورت پیالے اور کنگھیاں سامنے رکھ دیں۔ خلیفہ نے وزیر کے لیے ایک طشتری خریدا اور وزیر کی بیوی کے لیے ایک خوب صورت کنگھی۔ اچانک خلیفہ کی نظر ایک ننھّے سے صندوقچے پر پڑی جس میں سیاہ رنگ کا کوئی سفوف رکھا ہوا تھا اور ایک کاغذ جس پر کچھ عجیب و غریب سی لکھاوٹ تھی۔

"یہ کیا ہے؟" خلیفہ نے سوداگر سے پوچھا۔

"جہاں پناہ! میں خود نہیں جانتا کہ اس صندوقچے میں کیا رکھا ہوا ہے۔ مکّے کے ایک سوداگر نے مجھے یہ صندوقچہ دیا تھا۔ آپ کو پسند ہو تو آپ کی نذر ہے۔"

خلیفہ کو پرانی اور انوکھی تحریروں سے خاص دل چسپی تھی۔ اس نے وہ کاغذ لے لیا اور

سوداگر کو رخصت کر دیا۔ پھر وزیر سے دریافت کیا، "کیا تم یہ تحریر پڑھ سکتے ہو؟"

وزیر نے جواب دیا، "جی نہیں، مگر بڑی مسجد کے قریب ایک شخص رہتا ہے، اس کا نام سلیم ہے۔ اسے بہت سی پرانی زبانیں آتی ہیں۔ شاید وہ پڑھ لے۔"

خلیفہ نے اسی وقت سلیم کو بُلوا بھیجا۔ سلیم چند لمحوں بعد آ پہنچا۔ خلیفہ نے کہا، "لوگ تمھیں عالم کہتے ہیں۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کا مطلب بتاؤ۔ اگر تم کام یاب ہوئے تو انعام پاؤ گے۔ نہیں تو تمھیں سزا دی جائے گی۔"

سلیم نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی۔ پھر کہا، "یہ تحریر لاطینی زبان میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی صندوقچے میں رکھے ہوئے سفوف کو سونگھ کر "معتبر" کہے گا اس کی شکل اپنے آپ اس کی پسند کے کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی اور وہ جانوروں کی بولی بھی سمجھنے لگے گا۔ پھر جب وہ دوبارہ انسان بننا چاہے تو مشرق کی طرف تین بار سر جھکا کر اسے لفظ "معتبر" کہنا پڑے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ جانور کی شکل اختیار کرنے کے بعد وہ بھولے سے بھی مسکرانے کی کوشش نہ کرے۔ نہیں تو ہمیشہ جانور ہی رہے گا۔"

سلیم کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ نے بہت پُرجوش انداز میں اس کو شاباش دی۔ اسے انعام و اکرام بھی دیا اور اس سے یہ عہد کروایا کہ وہ کسی کے سامنے اس بات کا تذکرہ نہیں کرے گا۔

سلیم کے جانے کے بعد خلیفہ نے وزیر سے کہا، "منصور! یہ تو بہت شان دار چیز ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ کل صبح تم یہاں آ جاؤ۔ پھر کسی سنسان جگہ پر چل کر ہم اس سفوف کا تجربہ کریں گے۔"

دوسرے دن خلیفہ صبح کے ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وزیر آ پہنچا۔ خلیفہ نے اپنے مسلح باڈی گارڈ کو حکم دیا کہ صندوقچہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ کچھ دیر دونوں محل کے گرد پھیلے ہوئے باغوں میں کسی جان دار مخلوق کی تلاش کرتے رہے۔ اس تلاش میں ناکامی ہوئی تو منصور نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ جھیل کی طرف چلا جائے۔ وہاں سارس، بگلے اور دوسرے آبی پرندے ضرور موجود ہوتے ہیں۔

خلیفہ نے منصور کی بات مان لی۔ دونوں جھیل کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ کنارے تک پہنچے ہی تھے کہ انھیں ایک سارس نظر آیا جو اپنی لمبی چونچ زمین پر جھکائے مینڈکوں کی تلاش میں مصروف

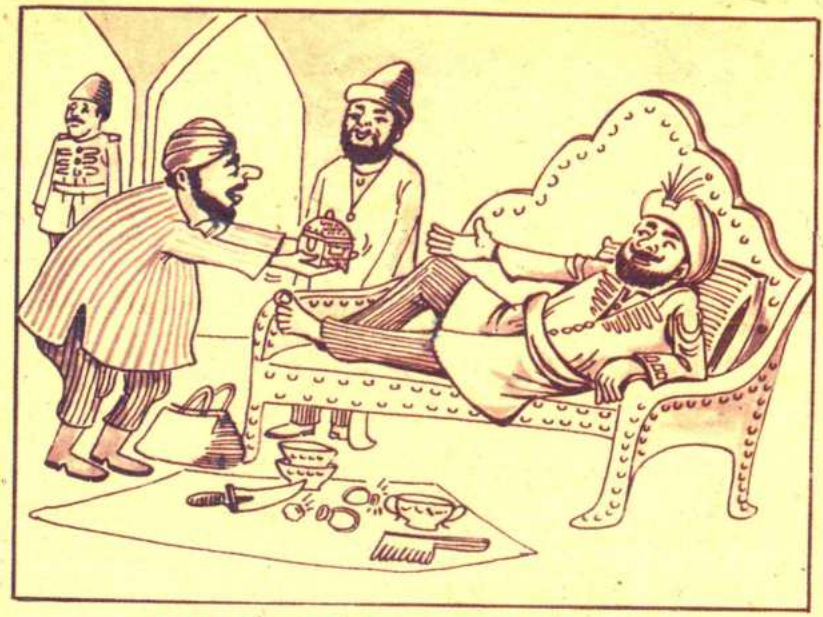

خلیفہ کی نظر صندوقچے پر پڑی جس میں سیاہ رنگ کا سفوف رکھا ہوا تھا۔

تھا۔ ایک اور سارس ہوا میں اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔

وزیر نے پُرجوش انداز میں کہا، "یہ دونوں سارس ابھی آپس میں گپ لڑائیں گے، کیوں نہ ہم خود کو سارس میں تبدیل کر لیں۔"

خلیفہ نے منصور کی تائید کی، "ٹھیک ہے، لیکن پہلے ہم یہ اچھی طرح یاد کر لیں کہ جب ہم دوبارہ آدمی بننا چاہیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کیوں؟ ہاں! ہمیں مشرق کی طرف تین مرتبہ سر جھکا کر ایک لفظ کہنا ہوگا، "معتبر"۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کسی بھی طرح ہنسی نہ آنے پائے نہیں تو ہم سارس ہی بنے رہ جائیں گے۔"

اتنے میں اوپر اُڑتا ہوا سارس دھیرے دھیرے پروں کو سمیٹتا ہوا نیچے اُترا۔ خلیفہ نے جلدی سے صندوقچہ کھولا۔ چٹکی بھر سفوف نکال کر سونگھا اور پھر ایک چٹکی بھر سفوف منصور کی طرف بڑھا دیا۔ پھر دونوں مشرق کی سمت تین بار جُھکے اور ایک ساتھ چلائے:

"معتبر!"

اچانک دونوں تیزی سے بدلنے لگے۔ ان کے پاؤں لمبی لال چھڑیوں جیسے ہو گئے۔ پیلے رنگ کی چپلیں سارس کے پنجوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بازو ڈینے بن گئے۔ گردن لمبی ہو گئی۔ داڑھیاں غائب ہو گئیں اور سارے بدن پر نرم نرم سفید پَر اُگ آئے۔

"واہ! تمھاری چونچ کتنی خوب صورت ہے!" خلیفہ نے تعریفی انداز میں وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ حضور!" منصور نے بڑے ادب سے کہا۔ پھر بولا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو یہ عرض کروں کہ آپ سارس کی شکل میں اپنی اصل صورت سے زیادہ شان دار نظر آ رہے ہیں۔ اب ہم ذرا ان سارسوں کے پاس چل کر ان کی باتیں سُنیں۔ ذرا یہ دیکھیں کہ ہم ان کی بولی سمجھ پاتے ہیں یا نہیں۔"

ہوا میں اُڑتا ہوا سارس زمین پر اُترنے کے بعد چونچ سے اپنے پاؤں صاف کر رہا تھا پھر اس نے اپنے پَر جھاڑے اور دوسرے سارس کی طرف بڑھا۔

"کہو دوست کیا حال ہے؟" پہلے سارس نے دوسرے سارس سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے دوست! میں ذرا اپنے ناشتے کا انتظام کر رہا تھا۔ کہو تو تمھیں بھی ایک آدھ مینڈک یا چھپکلی کی ٹانگ پیش کروں؟"

"بہت بہت شکریہ بھائی! آج پتا نہیں کیوں بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں تو بس یونہی کچھ دیر یہاں سکون سے گزارنے کے لیے چلی آئی۔ آج میرے والد کے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے ان کے سامنے رقص کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی مشق کر لوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ خلیفہ اور وزیر انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی باتیں سُن کر انھیں یہ پتا چلا کہ ان میں ایک سارس نر ہے اور ایک مادہ۔ مادہ سارس اپنی لمبی گردن ہلا ہلا کر بڑے جوش کے ساتھ ناچنے میں مگن تھی۔ نر سارس اس کی طرف تحسین آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک مادہ سارس نے ناچتے ناچتے اپنی ایک ٹانگ اوپر اُٹھا لی اور دوسری ٹانگ پر کھڑی ہو کر چکر پھیریاں لینے لگی۔ وہ ایک ہی جگہ چکّر کاٹتی جاتی تھی اور اپنے پروں کو پنکھوں کی طرح ہلا رہی تھی۔

اس کو ناچ میں اتنا مگن دیکھ کر خلیفہ اور وزیر دونوں زور سے ہنس پڑے۔ ہنسی کی آواز نے دونوں کو ڈرا دیا۔ جلدی سے انھوں نے اپنے پَر کھولے اور یہ جا، وہ جا! بڑی مشکل سے خلیفہ

اور وزیر نے اپنی ہنسی روکی۔

"واہ بھئی واہ! کیا شان دار رقص تھا!" خلیفہ نے کہا۔

پھر اچانک وزیر کو یاد آیا کہ انھیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ چیخ کر بولا، "حضور! ہم سے بڑی بھول ہوئی ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا۔ اب ہم شاید دوبارہ آدمی نہ بن پائیں۔"

خلیفہ یہ سنتے ہی ڈر سے کانپ اُٹھا، "کیا کہا؟" اس نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں کہا، "ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا۔ ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا۔ اف! یہ کیا ہوا۔ وہ کیا لفظ تھا؟ تین بار مشرق کی طرف سر جھکا کر کچھ کہنا تھا نا؟ یاد کرو! کیا لفظ تھا وہ....؟.... مع! مع! مع!"

دونوں مشرق کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ تین بار اپنے اپنے سر جھکائے۔ ہزار کوشش کی، لیکن وہ لفظ یاد نہ آیا۔ اب کیا ہو گا؟ کیا وہ پھر سے آدمی نہ بن سکیں گے۔ دونوں اپنی حالت پر رو دیے۔

خلیفہ اور وزیر منصور دونوں سارس بنے، دن بھر کھیتوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی اس حالت سے نجات پائیں اور دوبارہ آدمیت کے جامے میں واپس آئیں۔ واپس شہر آنے کی ان میں ہمّت نہ تھی۔ بھلا کون یقین کرے گا کہ وہ سارس نہیں بلکہ خلیفہ اور وزیر ہیں! اگر وہ کسی طرح لوگوں کو اپنی اصلیت کا یقین دِلا بھی دیں تو کون چاہے گا کہ ملک کا انتظام دو سارسوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

کئی روز تک وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ بھوک لگتی تو باغوں میں جا کر پھل کھا لیتے۔ لمبی لمبی چونچوں سے پھل کترنا انھیں بہت مشکل لگتا تھا۔ لیکن چھپکلی یا مینڈک کھانے کے تصوّر سے بھی ان کا جی متلانے لگتا تھا۔ ان کے لیے دل بہلانے کی صرف ایک صورت تھی کہ بغداد کی حویلیوں کے اوپر کچھ دیر اُڑ لیں اور اپنے شہر کا حال دیکھ لیں۔

اِدھر شہر کے لوگ حیران تھے کہ بادشاہ اور وزیر اچانک کہاں چلے گئے۔ انھیں زمین کھا گئی کہ آسمان۔ ان کے غائب ہونے پر شہر والوں نے تین دن تک ان کا سوگ منایا۔ چوتھے دن اپنی اُڑان کے دوران خلیفہ اور وزیر نے شہر کی طرف نظر دوڑائی تو کیا دیکھا کہ ایک شان دار جلوس سڑک پر چلا

جا رہا ہے۔ ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔ جلوس کے آگے آگے ایک خوب سجا دھجا گھوڑا ہے۔ گھوڑے پر ایک شخص سنہرا زرتار لباس پہنے شان سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے خادموں کی صف ہے۔ صف سے پیچھے شہر کی آبادی کا ہجوم اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

"مرزا، زندہ باد!"

"شاہ بغداد، زندہ باد!"

خلیفہ اور وزیر نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خلیفہ نے کہا:

"منصور! دیکھو مجھ پر یہ کیسا قہر نازل ہوا ہے! یہ مرزا جو گھوڑے پر سوار ہے میرے سب سے بڑے دشمن کشنو جادوگر کا بیٹا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے جادوگر کو کسی بات پر سزا دی تھی اور اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی پلٹ کر مجھ سے بدلا ضرور لے گا۔ خیر میں ابھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ چلو! ہم ایک بزرگ کی قبر پر چل کر دعا کرتے ہیں۔ شاید اللہ ہماری سُن لے۔"

دونوں نے ایک سمت اُڑان بھری۔ تھکن سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ لمبی اُڑان کا یہ پہلا موقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وزیر کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا، "حضور! اب مجھ سے نہیں اُڑا جاتا۔ آپ مجھ سے تیز اُڑتے ہیں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ پھر شام ہونے کو آئی۔ ہمیں کہیں نہ کہیں رات بسر کرنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ کیوں نہ ہم بقیہ سفر کل پر چھوڑ دیں؟"

خلیفہ پر بھی تھکن چھائی ہوئی تھی۔ منصور کی تجویز سے اس نے اتفاق کیا۔ نیچے وادی میں انھیں کچھ کھنڈر دکھائی دیے۔ دونوں نے وہیں رات گزارنے کا قصد کیا اور زمین پر اُتر آئے۔ یہ کھنڈر کسی زمانے میں قلعہ رہا ہوگا۔ لمبے لمبے ستون، خوب صورت محرابیں، اکّا دُکّا چھتیں ابھی باقی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جگہ بہت شان دار رہی ہوگی۔ دونوں راہداری سے گزرتے ہوئے ایک موڑ پر پہنچے اور اچانک منصور کے پاؤں جم سے گئے۔

منصور نے سرگوشی کے انداز میں کہا، "حضور والا! ہو سکتا ہے آپ اسے بے وقوفی کی بات سمجھیں، مگر ابھی ابھی میں نے ایک عجیب سی آواز سُنی ہے۔ جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ مجھے بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

خلیفہ بھی ٹھیر گیا اور اس نے بھی کان لگائے تو ویسی ہی آواز سنائی دی۔ یہ کسی جانور کے

بجائے کسی انسان کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ حقیقت جاننے کے لیے خلیفہ آواز کی سمت میں تیزی سے بڑھا، لیکن منصور نے فوراً اس کے پَر مضبوطی سے پکڑ لیے اور درخواست کی کہ یوں بلا جانے بوجھے وہ جان خطرے میں نہ ڈالے۔ خلیفہ نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس نے جھٹک کر اپنے پَر منصور کی چونچ سے چھڑائے اور اسی اندھیری سمت میں چل پڑا۔ آگے اسے ایک دروازہ دکھائی دیا جو پورا کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے پیچھے سے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ خلیفہ اپنی چونچ دروازے کے ایک پٹ سے لگائے چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے ایک کمرا سا تھا۔ ایک دیوار میں کھڑکی تھی جس سے کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ خلیفہ نے جھانک کر دیکھا تو فرش پر ایک بڑا سا اُلّو نظر آیا۔ اُلّو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنی مُڑی ہوئی چونچ جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

جیسے ہی اُلّو کی نظر خلیفہ اور منصور پر پڑی اس نے پَر پھڑپھڑائے اور خوشی سے چلانے لگا۔ ایک ڈبے کو اُٹھا کر اس نے پَر سے اپنے آنسو پونچھے اور بہت صاف ستھری عربی زبان میں دونوں

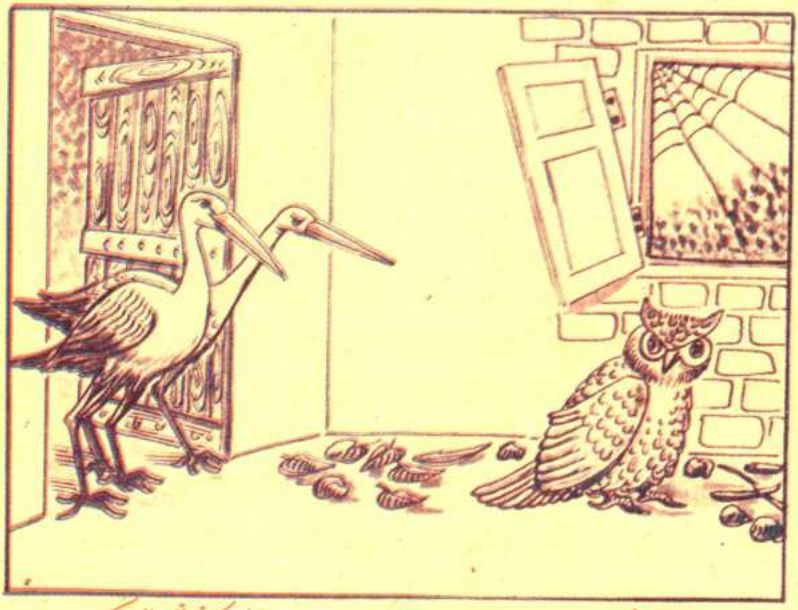

جیسے ہی اُلّو کی نظر خلیفہ اور منصور پر پڑی اس نے پَر پھڑپھڑا کر خوشی ظاہر کی۔

کو مخاطب کیا۔

"آؤ دوستو! خوش آمدید۔ تمھیں دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں۔ تمھارا آنا میرے لیے مبارک ہو گا۔ میرے بارے میں یہ پیشین گوئی کی جا چکی ہے کہ ایک روز دو سادھو میرے پاس آئیں گے اور ان کے آنے سے میری تقدیر سنور جائے گی۔"

خلیفہ اور وزیر سکتے میں آ گئے۔ چند لمحوں بعد خلیفہ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں جوڑے اور گردن آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"اُلوصاحبہ! آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ افسوس ہم خود ایسے حال میں ہیں کہ شاید ہی آپ کی مدد کر سکیں۔ ہم آپ کو اپنی آپ بیتی سُنائیں گے۔ اس سے اندازہ کیجیے گا کہ ہم پر بھی کیسی تباہی آئی ہے۔"

اُلو نے ان کی کہانی سننے کے لیے اشتیاق ظاہر کیا اور خلیفہ نے سارا قصہ کہہ سُنایا۔ وہ چپ ہوا تو اُلو بیگم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی روداد شروع کر دی۔

"اب سنو! میری کہانی سنو۔ میں بھی تمھاری ہی طرح بدنصیب ہوں۔ میرے باپ ہندوستان کے ایک راجا ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا نام لوسا ہے۔ وہی جادوگر کشنو جس نے تمھیں دھوکا دیا، اُسی نے مجھے بھی اس حال کو پہنچایا ہے۔ ایک روز میرے باپ کے پاس آیا اور بولا کہ وہ اپنے بیٹے مرزا کی شادی مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ میرے باپ نے دھکّے دے کر اسے محل سے باہر نکلوا دیا۔

پھر وہ بھیس بدل کر ایک دن آیا۔ میں اس وقت محل کے باغ میں تھی۔ مجھے بھوک لگی۔ میں نے کھانے کے لیے کچھ لانے کا حکم دیا۔ کشنو جادوگر نے غلام کا بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ میرے لیے شربت بھی لے آیا اور پھر اس شربت کو پیتے ہی اچانک میں اس حال کو پہنچ گئی۔ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ کشنو نے مجھے دبوچ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے کڑک دار آواز میں کہا: "اب تم اسی طرح بدصورت بنی ہوئی یہاں پڑی رہو گی۔ کوئی جانور بھی تمھیں منھ نہ لگائے گا۔ اس حال میں تم سے اب کون شادی کرے گا۔ تم اسی طرح پڑے پڑے مرجاؤ گی میں نے تم سے اور تمھارے مغرور باپ سے اپنی توہین کا بدلا لیا ہے۔"

"جب سے اب تک کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں اداس اور اکیلی اس ویرانے میں پڑی ہوئی

ہوں۔ دن بھر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس رات کو جب چاندنی پھیلتی ہے مجھے اردگرد کی دنیا نظر آجاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اُلّو بیگم نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور پھر زور زور سے رونے لگی۔ خلیفہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے دھیرے سے کہا، "ہماری اور تمھاری بدنصیبی میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمے کو حل کیسے کیا جائے؟"

اُلّو بیگم نے جواب دیا، "جی ہاں! مجھے یاد ہے، میرے بچپن میں ایک بوڑھی عورت نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ایک سارس کبھی نہ کبھی مجھے بدنصیبی کے جال سے نکالے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گھڑی آگئی ہے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے!"

"کیا؟" خلیفہ نے پوچھا۔

"کشنو جادوگر مہینے میں بس ایک بار یہاں آتا ہے۔ اس کھنڈر میں ایک بہت بڑا سا ہال ہے۔ کشنو جادوگر اسی ہال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ کیا پتا کسی دن کشنو یا اس کا کوئی ساتھی وہ لفظ زبان پر لے آئے جسے آپ بھول چکے ہیں۔"

علیفہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور چونچ اُٹھا کر بے قراری سے اس نے کہا، "پیاری راج کماری! مجھے جلدی بتاؤ وہ اب کب آئیں گے!"

اُلّو بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دھیرے سے بولی، "آپ بُرا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ میری ایک شرط ہے۔ اگر آپ وہ شرط مان لیں تو بتا دوں گی!"

"کہو کہو! مجھے منظور ہے!" خلیفہ نے جلدی سے کہا۔

"میں اپنی حالت سے اسی صورت سے نکل سکتی ہوں جب آپ دونوں میں سے کوئی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔"

یہ سُن کر خلیفہ اور وزیر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ پھر خلیفہ نے وزیر کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں اس کمرے سے باہر نکل گئے تو خلیفہ نے کہا، "منصور! مجھے یہ احساس ہے کہ میں تم سے ایک نامناسب درخواست کرنے جا رہا ہوں، مگر کیا تم اُلّو بیگم سے شادی کر لو گے؟"

وزیر نے ذرا اونچی آواز میں کہا، "میری بیوی تو میری آنکھیں نوچ لے گی۔ پھر میں ایک بوڑھا آدمی ہوں آپ نوجوان ہیں اور بہتر یہی ہو گا کہ ایک حسین راج کماری سے آپ ہی شادی

کر لیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" خلیفہ بولا، "مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اُلّو بیگم واقعی حسین اور نوجوان راج کماری ہے۔ مان لو ایسا نہ ہوا تو؟ میں اندھیرے میں چھلانگ کیسے لگا دوں؟"

کچھ دیر تک وہ اسی طرح بحث کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے تھے۔ جب وزیر پر خلیفہ کی بات کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو آخر کار خود خلیفہ نے اُلّو بیگم کی شرط قبول کر لی۔

اُلّو بیگم کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے کہا، "کشنو جادوگر آج ہی رات وہاں آئے گا۔" پھر وہ انھیں اس بڑے ہال کی طرف لے گئی۔ اس نے دونوں کو تاکید کی کہ ذرا سی بھی آواز نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ چھپ کر انھوں نے ہال کی طرف نظریں جما دیں۔ جب اندھیرا کچھ اور گہرا ہوا تو کشنو اور اس کے ساتھی ہال میں داخل ہوئے اور ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ انھی میں وہ سوداگر بھی تھا جس سے خلیفہ نے کالا سفوف لیا تھا۔ جو آدمی سوداگر کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، اُس نے سوداگر سے خلیفہ اور منصور کا قصّہ سنانے کی درخواست کی۔ سوداگر نے قصّہ چھیڑ دیا۔

"وہ لفظ کیا تھا جسے تین مرتبہ دہرانے پر وہ دوبارہ انسان بن سکتے تھے؟" ایک نے پوچھا۔

"معتبر!" سوداگر نے جواب دیا۔

یہ سُننا تھا کہ خلیفہ اور منصور خوشی سے اُچھل پڑے۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے کھنڈر سے باہر نکل گئے۔ بے چاری اُلّو بیگم کی رفتار بہت سُست تھی، لیکن کسی طرح لشم پشم وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکلی۔

خلیفہ نے اُلّو بیگم سے کہا، "تم نے ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کی راہ دکھائی ہے۔ تمھارے اس احسان کے بدلے میں اب میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں!"

پھر خلیفہ اور وزیر مشرق کی طرف منھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ تین مرتبہ انھوں نے اپنی لمبی گردنیں جھکائیں اور ایک ساتھ چلائے:

"معتبر!"

اور پل بھر میں وہ سارس سے دوبارہ انسان بن گئے۔ خلیفہ اور منصور نے خوش خوش ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بھی رواں

تھے۔ پھر جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے انھیں اپنے قریب ہی ایک بہت حسین راج کماری دکھائی دی۔ اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا اور شرما شرما کر مسکرائے جا رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے خلیفہ کا ہاتھ تھام لیا۔

خلیفہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ راج کماری نے ہنس کر کہا، "آپ شاید اُلّو بیگم کو بھول گئے؟"

پھر خلیفہ اور راج کماری ایک ساتھ ہنس پڑے۔ خلیفہ نے کہا، "میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ نہ سارس بنتا نہ اس طرح تم سے ملاقات ہوتی!"

کچھ دیر بعد وہ تینوں بغداد کی طرف چل پڑے۔ خلیفہ کو اپنی جیب میں اس کالے سفوف کے ساتھ اپنا بٹوا بھی مل گیا جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔ قریب کے گاؤں سے انھوں نے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں اور جلد ہی بغداد پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں نے اچانک خلیفہ اور وزیر کو دیکھا تو خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خلیفہ اور وزیر کہیں مر کھپ گئے۔ اپنے پیارے حکم راں کو انھوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر لوگوں کا ہجوم محل میں جا گھسا۔ کشنو جادوگر اور اس کے بیٹے مرزا کو پکڑ کر لوگ خلیفہ کے پاس لے آئے۔ کشنو جادوگر کو اسی کھنڈر میں لے جا کر پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بیٹے مرزا کو خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ یا تو موت کی سزا قبول کرے یا پھر وہی کالا سفوف سونگھ کر سارس بن جائے۔ مرزا نے مرنے کے بجائے سارس بننا قبول کیا۔ پھر اس کے سارس بنتے ہی خلیفہ نے اسے ایک پنجرے میں قید کر کے محل کے باغ میں رکھوا دیا۔

راج کماری سے شادی کرنے کے بعد خلیفہ نے بہت برسوں تک چین سے حکومت کی۔ کبھی کبھی وہ اپنے اس تجربے کو یاد کرتے اور خوب ہنستے۔ ان کے بچّے جب یہ قصّہ سنتے تو حیران بھی ہوتے اور انھیں ہنسی بھی آتی۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

NAB-84 PID(1)
MCB-15

جی ہاں

فیض احمد فیض

ایک مرتبہ ہم مشاعرہ میں خیرپور (سندھ) گئے۔ ہم اُس وقت پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ہماری رہائش کا بندوبست منتظمینِ مشاعرہ نے کسی انجینئر کے گھر کیا تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا اور ہم اپنے میزبان کے ہاں پہنچے۔ ہمارے ساتھ چند اور شرائے کرام بھی تھے۔ پروفیسر منظور حسین شور بھی تھے۔ صاحبِ خانہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ ہم سب اطمینان سے ان کے صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں انجینئر صاحب تشریف لائے پروفیسر شور نے ہمارا تعارف کرایا: "یہ فیض ہیں"۔

انجینئر صاحب نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور صرف مصافحہ کرتے ہوئے "ہوں" پر ہی اکتفا کیا۔

بے چارے شور صاحب پریشان ہوئے انھوں نے تقریباً شور مچاتے ہوئے کہا، "بھئی یہ فیض احمد فیض ہیں۔ بڑے شاعر ہیں"۔

انجینئر صاحب نے اب دوم مرتبہ "ہوں، ہوں" کیا۔ شور صاحب بلبلا اُٹھے کہنے لگے:

"بھئی یہ فیض صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ یہ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں"۔

انجینئر صاحب چونکے جیسے کوئی بچہ خواب میں پریشان ہو کر چونک اُٹھے۔ کہنے لگے، "آپ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر ہیں؟"

ہم نے کہا، "جی ہاں"۔

"مگر وہ تو انگریزی کا اخبار ہے؟" انجینئر صاحب نے انگریزی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہم نے کہا، "جی ہاں"۔

"مگر آپ مشاعرہ میں تشریف لائے ہیں؟"

عرض کیا، "جی ہاں"۔

کہنے لگے، "مشاعرہ تو اردو میں ہے"۔

عرض کیا، "جی ہاں"۔

کہنے لگے، "آپ اردو میں شعر کہہ لیتے ہیں؟"

ہم نے کہا، "جی ہاں"۔

"مگر یہ اخبار تو بہت بڑا اخبار ہے۔ اُس کے کام سے فرصت تو مشکل سے ہی ملتی ہو گی؟"

عرض کیا، "جی ہاں"۔ شور صاحب دھڑام سے کرسی پر گرے اور خاموش ہو گئے۔

انجینئر صاحب کہنے لگے، "فیض صاحب آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ پاکستان ٹائمز کہاں اور یہ شعر اور مشاعرہ کہاں؟ آپ کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ جائیں اخبار کو ٹھیک طریقے سے چلائیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے"۔ میں نے عرض کیا، "جی ہاں"۔

س: بجلی آسمان پر کس وجہ سے چمکتی ہے؟ محمد بصیر الزماں، کراچی

ج: آسمان پر جو بادل آپ کو نظر آتے ہیں، وہ نمی اور بے شمار ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ مستقل رگڑ کی وجہ سے یہ ذرات چارج ہو جاتے ہیں اور کسی بادل پر مثبت اور کسی پر منفی برقی چارج پیدا ہو جاتا ہے، چوں کہ مخالف چارج ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں اور آپس میں ملنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے جیسے ہی مخالف چارج والے دو بادل ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں منفی چارج مثبت چارج کی طرف دوڑتا ہے۔ اس وقت آپ کو آسمان پر شرارہ نظر آتا ہے اور آپ اسے آسمانی بجلی کہتے ہیں۔ درمیان میں ہوا اس عمل میں مزاحمت کرتی ہے، جسے یہ چارج توڑ دیتا ہے اُس وقت زبردست کڑاکا سنائی دیتا ہے۔ جسے عام زبان میں گرج کہتے ہیں۔

س: ٹرانسمیٹر کیا ہوتا ہے؟ یہ اپنا کام کس طرح کرتا ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں؟
محمد سہیل محمد یوسف چھیپہ، کراچی

ج: ٹرانسمیٹر کے انگریزی میں معنی ہیں بھیجنے والا، لہٰذا کوئی بھی ایسا انتظام جس کے تحت سگنل یا پیغامات نشر کیے جاتے ہوں یا بھیجے جاتے ہوں ٹرانسمیٹر کہلائے گا۔ یہ مشین چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو اسٹوڈیو، جو شہر میں کہیں واقع ہوتے ہیں اور جن میں پروگرام کیے جاتے ہیں۔ دوسرے ٹرانسمیٹر جو شہر کے

باہر واقع ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ اونچے اونچے کھمبے لگے ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو سے آنے والے سگنل اس ٹرانسمیٹر کے ذریعہ سے نشر کیے جاتے ہیں جو آپ کے ریڈیو سیٹ میں داخل ہو کر آپ کو وہ پروگرام سُنا دیتے ہیں۔ اس طرح ٹیلے فون کا وہ حصّہ بھی ٹرانسمیٹر کہلاتا ہے جس میں آپ بولتے ہیں، کیوں کہ وہ آپ کی آواز کی لہروں کو برقی ارتعاشات میں تبدیل کر کے آگے بھیجتا ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو ہم ٹیلے فون پر گفت گو نہیں کر سکتے۔

س: جب ٹھوس، مائع اور گیس کو اُبالا جاتا ہے تو وہ پھیل جاتے ہیں۔ اگر انڈے کو اُبالا جاتا ہے تو وہ جم کیوں جاتا ہے؟ محمد عرفان، کراچی

ج: یہ صحیح ہے کہ چیزیں گرم ہو کر بالعموم پھیلتی ہیں۔ انڈے کی زردی سفیدی ایک خول میں بند ہوتی ہے۔ انھیں جب اُبالا جاتا ہے تو اپنی بناوٹ کی وجہ سے وہ جم جاتی ہیں، لیکن بعض اوقات پھیل بھی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ زیادہ دیر اُبالا جائے تو انڈے کا چھلکا پھٹ جاتا ہے اور زردی سفیدی باہر نکل آتی ہیں۔ یہ پھیلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

س: ہم نے پڑھا ہے کہ بجلی خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے، لیکن آسمانی بجلی ہمیں ٹیڑھے راستوں پر نظر آتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ محمد قیصر فہیم، خان پور

ج: جب مخالف چارج یعنی مثبت اور منفی چارج سے بھرے ہوئے دو بادل ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو منفی چارج مثبت چارج کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے۔ درمیان میں ہوا ہوتی ہے جو اس عمل میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ چارج اس رکاوٹ یا مزاحمت سے بچنے کے لیے ٹیڑھا میڑھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس راستے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں مزاحمت کم سے کم ہو۔

س: مقناطیسیت چیزوں کو اپنی طرف کیسے کھینچتی ہے؟ رضوان روشن علی، کراچی

ج: مقناطیسیت ایک طرح کی قوت ہے جو بعض چیزوں میں اُن کے ذرّات کے ایک خاص طرح ترتیب پانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جب آپ کسی مقناطیس کو لوہے کے ذرّات

کے قریب لاتے ہیں تو یہ ذرّات اس سے چپک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقناطیس اپنے اثر سے قریب کی چیز پر مخالف قطب پیدا کر لیتا ہے اور چوں کہ مخالف قطبین ایک دوسرے کو کھینچتے یا کشش کرتے ہیں اس لیے وہ چیز مقناطیس کی طرف کھنچ آتی ہے۔

س: دنیا کی سب سے پہلی ایجاد کون سی ہے؟ خالد محمود قریشی، کراچی

ج: کام کی چیز جو انسان نے سب سے پہلے ایجاد کی اور جسے مشنری کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے پہیّا ہے۔

س: رنگ کیا ہیں؟ ہم انھیں کیسے محسوس کرتے ہیں؟ ملک فیاض محمد اعوان، ہزارہ

ج: سفید روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ بنفشی، کاہی، نیلا، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ۔ یہ سب رنگ مل کر سفیدی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ہماری آنکھ میں قدرتی طور پر رنگوں کو محسوس کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ گلاب کا پھول سرخ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھول سرخ شعاعوں کے علاوہ باقی چھے رنگوں کی شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ صرف سرخ رنگ کی شعاعوں کو واپس ہماری طرف بھیج رہا ہے اور ہماری آنکھ سرخ رنگ سے متاثر ہو رہی ہے۔ یہی صورت دوسرے رنگوں کی ہے۔ جب کوئی بھی رنگ واپس نہ آئے تو وہ چیز سیاہ نظر آتی ہے۔

س: ایئر کنڈیشنر کس طرح کمرے کو ٹھنڈا کرتا ہے؟ عیسیٰ علی خاں، کراچی

ج: ایئر کنڈیشنر میں اندر کی گرم ہوا باہر پھینکنے اور باہر کی ہوا کمرے میں لانے کا انتظام ہوتا ہے۔ اندر آنے والی ہوا ایک گیس کی نالیوں میں ہوتی ہوئی آتی ہے جو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ یہ گیس ہی کمرے میں خنکی پیدا کرنے کی ذمے دار ہے۔ باہر سے اندر آنے والی ہوا گیس کی نالیوں کو چھو کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور کمرے کا درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔

نونہال مصوّر

منیر احمد فاضل، لاہور

سید اظفر مہدی، سکھر

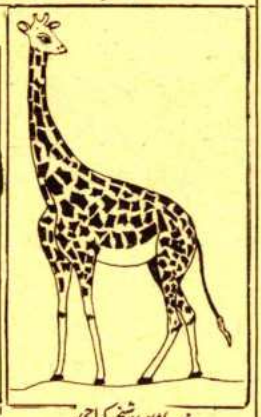

محمد یامین شیخ، کراچی

شعیب اللہ شیخ، کراچی

اخبار نونہال

عجیب گنبد

اصفہان کی مسجد شاہ عباس دنیا کی مشہور مسجدوں میں سے ایک ہے اور اس کا گنبد عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر تالی بجائی جائے تو ایک ہی گونج کے بجائے وقفے وقفے سے کئی تالیوں کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ گنبد کی دو تہیں ہیں۔ اندر کی طرف سے گنبد کی اونچائی چونتیس میٹر اور باہر کی طرف چون میٹر ہے۔ یہ مسجد ۱۶۱۸ء میں شاہ عباس کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن گنبد کی تکمیل مسجد بننے کے تیرہ سال کے بعد ہوئی تھی۔

مرسلہ: خالد نور خاں، کورنگی

سب سے وزنی ہاتھی

افریقہ کے ملک انگولا میں ۱۳۔ نومبر ۱۹۵۵ء کو ایک شکاری "جوزف فینی کووی" نے ایک ہاتھی کو مار گرایا جو ۱۳ فیٹ بارہ انچ تھا۔ جب اس کا وزن کیا گیا تو وہ بارہ ٹن وزنی نکلا۔ تاریخِ عالم میں اتنا بڑا اور وزنی ہاتھی کبھی نہیں مارا گیا۔

مرسلہ: نذیر احمد بلوچ، آسو گوٹھ ملیر

مشینی آدمی نے اپریشن میں مدد کی

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر لانگ بیچ میں سرطان کے ایک مریض کے دماغ سے رسولی نکالنے کے اپریشن میں ایک مشینی آدمی (روبوٹ) نے بھی حصّہ لیا۔ یہ دنیا کا پہلا اپریشن ہے جو روبوٹ کی مدد سے کیا گیا۔

مرسلہ: شاہد احمد شانی، فیصل آباد

موت کا انعام

برطانیہ میں پرانے زمانے میں جن معزز لوگوں کو موت کی سزا ہوتی تھی وہ اپنے جلادوں کو سات پونڈ سے دس پونڈ تک کی رقم انعام دیا کرتے تھے۔ اس انعام کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہایت تیزی، پھرتی اور جلدی سے ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دے۔

مرسلہ: محمد احسان، کراچی

سب سے کم عمر مصنّفہ

۱۹۷۹ء تک دنیا کی سب سے کم عمر مصنّفہ ہونے کا اعزاز برطانیہ کی جینی ایجیسن کو حاصل رہا۔ انھوں نے بچّوں کے لیے "قزاقوں کی حکایتیں" نامی کتاب ۵ سال کی عمر میں لکھی تھی، لیکن یہ کتاب ایک سال بعد اپریل ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت جینی ۶ سال کی ہو چکی تھیں۔

تازہ ترین تحقیقات کے مطابق دراصل یہ اعزاز واشنگٹن کی ڈورتھی اسٹریٹ کو ملنا چاہیے جو ۲۵۔ مئی ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئیں اور چار سال کی عمر میں انھوں نے "دنیا کیسے بنی" نامی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اگست ۱۹۶۲ء میں "پینتھیون بکس" نامی ادارے نے نیویارک سے شائع کی تھی۔

مرسلہ: نسرین ایوب، شاہ فیصل کالونی

ناپسندیدہ چیز

نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے بہت سے طریقے ہیں، لیکن اٹلی کے لوگ نئے سال کی رات عجیب طرح سے مناتے ہیں۔ نئے سال کی رات آتی ہے تو اٹلی کی سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ ٹریفک ہوتا ہے نہ راہ گیر اور نہ پولیس۔ رات کے بارہ بجتے ہی مکانوں کی کھڑکیاں زور سے کھلتی ہیں اور موسیقی اور قہقہوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ گھر کا ہر آدمی اپنی ناپسندیدہ چیز پھینکنا شروع کر دیتا ہے، گویا یہ لوگ وہ تمام چیزیں پھینک دیتے ہیں جن سے پچھلے سال کوئی ناپسندیدہ یا ناگوار بات وابستہ ہو اور وہ ذہن سے نکال دینا چاہتے ہوں۔

مرسلہ: ساجدہ مختار، کراچی

UNION INTRODUCES ANOTHER QUALITY PRODUCT

UNION The Biggest name in wholesome taste

Midas KN

لطیفے

عفو و درگزر

مرسلہ: خالدہ پروین سیال، کراچی

مشہور سائنس داں سر آئزک نیوٹن کے پالتو کتے نے ایک بار اس کی لکھنے کی میز پر جلتا ہوا ٹیبل لیمپ اُلٹ دیا۔ میز کے کاغذات نے آگ پکڑ لی۔ اس میں نیوٹن کا کششِ ثقل پر مبنی اس مشہور تصنیف کا مسودہ بھی شامل تھا جسے وہ پچھلے بیس سال سے اَن تھک محنت کر کے مکمل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ جس وقت نیوٹن کمرے میں پہنچا تقریباً سب کاسب مسودہ جل چکا تھا۔ کتے کو اندر دوڑتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اسی نے لیمپ گرایا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اپنی محنت کے اس طرح ضائع ہونے پر وہ کھول اُٹھا تھا۔ اس نے چمکار کر کتے کو بُلایا اور پکڑ کر گود میں اُٹھا لیا، مگر پھر کچھ کرنے کے بجائے اس نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صرف اتنا کہا، "تم نہیں جانتے کہ تم نے آج کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔"

ایک انٹرویو

مرسلہ: اسد رحمان، ساہی وال

ایک پریس رپورٹر، عمران خان اور سُنیل گواسکر سے انٹرویو لینے گیا۔ سب سے پہلے اس نے سُنیل گواسکر سے سوال کیا، "یہ بتائیے کہ پاکستان کا کون کون سا کھلاڑی آپ کو دے دیا جائے جس سے آپ پوری دنیا کی کرکٹ ٹیم کو شکست دے سکیں۔"

سنیل گواسکر نے جواب دیا، "عمران خان، جاوید میانداد اور راجہ مل جائے تو میں پوری دنیا کو ہرا سکتا ہوں۔"

رپورٹر نے یہی سوال عمران خان سے کیا، "آپ کو ہندوستان کا کون کون سا کھلاڑی دے دیا جائے جس سے آپ پوری دنیا کی کرکٹ ٹیموں کو ہرا سکیں۔"

عمران خان نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا، "مجھے ہندوستان کا کھلاڑی نہیں بلکہ امپائر دے دیا جائے تو میں پوری دنیا کو ہرا سکتا ہوں۔"

ایک شعر

مرسلہ: محمد ایاز کلسی، شاہ پور چاکر

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

—— علامہ اقبال

زندگی

مرسلہ: فاطمہ قاسم، کراچی

زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ غلامی میں تعطل اور جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کے روشن چہرے

پر سیاہی چھا جاتی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اس امتحان گاہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ خود کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد رکھے۔ سخت محنت و مشقت کرے اور ان لمحات کو ضائع نہ کرے۔

اللہ کا بندہ

مرسلہ: محمد کاظم مسرور، دھنوٹ

ایک شخص درخت پر چڑھ کر چوری سے پھل توڑ رہا تھا۔ اتنے میں درخت کا مالک آ گیا۔ اس نے جب چور کو للکارا تو اس نے کہا، "اگر اللہ کے باغ سے اللہ کا ایک بندہ پھل کھائے تو تجھے ملامت کرنے کا کیا حق ہے؟"

مالک نے اپنے ملازم سے کہا، "ذرا رسّی تو لانا، تاکہ اس اللہ کے بندے کو جواب دیں۔" رسی آئی تو مالک نے اس شخص کو درخت سے باندھ دیا اور بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے کہا، "شرم کر، مجھے کیوں مارے ڈالتا ہے۔" مالک نے جواب دیا، "میں بھی اللہ کا بندہ ہوں اور تو بھی اللہ کا بندہ ہے۔ اللہ کا ایک بندہ دوسرے کو اللہ ہی کی لکڑی سے پیٹ رہا ہے۔ اس پر تجھے کیا اعتراض ہے۔" آخر اس چور نے توبہ کی اور رہا ہو کر گھر کو گیا۔

منزل کی لذّت

مرسلہ: محمد عمران خاں، کراچی

کچھ لوگوں کو دوسروں کو دکھ پہنچا کر ہی لذّت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے لیے منزل پر پہنچنے میں لذت ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی، ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم دوسروں کو حصولِ لذت سے محروم تو نہیں کر رہے ہیں۔ —— ابنِ منفی

ذکر مت کیجیے گا

مرسلہ: محمد امین منصوری

اٹلی کی سرکاری تقریب میں ایک سفیر کی گھڑی کھو گئی۔ سفیر نے وزیرِ داخلہ کو اس بارے میں بتایا۔ وزیرِ داخلہ انھیں خاموش رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے کہیں کھسک گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں وہی گھڑی تھی۔ سفیر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا، "جناب، آپ کو یہ کہاں سے ملی؟"

وزیرِ داخلہ نے آہستہ سے کہا، "کسی سے اس واقعے کا ذکر مت کیجیے گا۔ یہ گھڑی وزیرِ خارجہ کی جیب میں تھی اور انھیں بھی نہیں معلوم کہ یہ گھڑی میں نے ان کی جیب سے نکالی ہے۔"

سردی

مرسلہ: محمد امین منصوری

ایک محفل میں ایک صاحب انگلستان کی سردی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم جب صحن میں پانی پھینکتے تو وہ برف بن جاتا تھا۔ دوسرے صاحب فوراً بولے کہ چھوڑیے یہ بھی کوئی سردی ہے، ہم ناروے میں تھے تو جملے منھ سے نکلتے ہی فضا میں جم جاتے تھے، جنھیں سُننے کے لیے ہم ماچس کی تیلیوں سے

انھیں بگھلاتے تھے۔

خوشی

مرسلہ: حنا تبسم، شمالی ناظم آباد

خوشی نہ پھولوں کے جھرمٹ میں ہے نہ جگمگاتے ہوئے قمقموں میں ہے۔ میں نے تو باغ میں لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں بھی لوگوں کی آنکھیں اشک بار دیکھی ہیں۔ خوشی تو درحقیقت صرف اطمینانِ قلب کا نام ہے اور اگر دلوں کو سچا سکون اور اطمینان نصیب ہو جائے تو خوشی خود بہ خود ہمارا مقدر بن جائے گی۔ جب اطمینانِ قلب میسّر ہو تو کانٹوں کے بستر پر بھی نیند آجاتی ہے۔ دلوں کی بے سکونی اور بے چینی تو پھولوں کے بستر کو بھی کانٹوں کی سیج بنا دیتی ہے۔ غموں کو عام آدمیوں پر حاوی ہو جانے میں خاصی مہارت حاصل ہے، لیکن یہ مہارت اس وقت بے کار ہو جاتی ہے جب آپ کام میں مصروف ہوں۔ غم کا بہترین علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی تعمیری کام میں مصروف رکھیں۔

احساسات اور جذبات

مرسلہ: محمد سلیم ابراہیم، کراچی

انسانی زندگی کے ہزاروں واقعات ایسے ہیں جو عقل کی محدود چار دیواری سے گزر کر ملکِ دل کی لامحدود وسعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم دنیا کے ہر واقعے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو ہمارے لیے بعض اوقات نہایت ہی معمولی باتیں طلسم بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہم دوسروں کے احساسات اور جذبات کا اندازہ اپنے احساسات اور جذبات سے کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی وہ حرکات و سکنات جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں ہمارے لیے معمّا بن جاتی ہیں۔ آج کل کی ماؤں کو قرونِ اولیٰ کی ایک بہادر ماں کی تمنائیں اور دعائیں کس قدر عجیب معلوم ہوں گی۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آگ اور خون میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کی آرزو انھیں کس قدر بھیانک معلوم ہوتی ہوگی۔ اپنے بچّوں کو بلّی کا خوف دلا کر سُلانے والی مائیں ان کے متعلق شیروں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے خواب کب دیکھتی ہوں گی۔

ہمارے کالجوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں پلے ہوئے نوجوانوں کا علم اور عقل پہاڑوں کی بلندی اور سمندر کی گہرائی کو خاطر میں نہ لانے والے مجاہدوں کے دلوں کا راز کیسے جان سکتی ہے۔ رباب کے تاروں کی جنبش کے ساتھ لرز جانے والے نازک مزاج انسانوں کو تیروں اور نیزوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے جواں مردوں کی داستانیں کس قدر حیرت ناک معلوم ہوں گی۔ اپنے گھونسلے کے اردگرد چکّر لگانے والی چڑیا عقاب کے اندازِ پرواز سے کس طرح واقف ہو سکتی ہے۔

—— نسیم حجازی

موت کی خواہش

مرسلہ: ایم افضل زخمی، ڈگری

موت کی خواہش وہ لوگ کرتے ہیں جو زندگی کے مسائل کو سمجھ نہیں سکتے اور اگر سمجھ لیں تو ان کے حل کا طریقہ نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ سہل پسند ہوتے ہیں اور زندگی کی تکالیف و مصائب کا تدارک کرنے اور ان کا بھرپور مقابلہ کرنے کے بجائے ان کا مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں اور موت کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر

مرسلہ: شبانہ پروین، کراچی

مسز جیکی اپنے بیٹے کو جھنجھوڑ رہی تھی، "اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی اُٹھو تمہیں اسکول جانا ہے۔"

"ممی میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے اسکول سے نفرت ہے۔ بچے مجھے پسند نہیں کرتے اور میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اساتذہ مجھے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسکول کا سارا اسٹاف مجھے ناپسند کرتا ہے۔ غرض ہر کوئی مجھے پاگل سمجھتا ہے۔ کوئی بھی میری آمد پسند نہیں کرتا۔"

"مگر تمہیں اسکول جانا ہے۔" اس کی ممی نے کہا، "اب تم بچے نہیں چالیس برس کے ہو اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو۔"

آخری خواہش

مرسلہ: ثروت رحمٰن، کراچی

تین دوست سمندر میں کشتی پر سفر کر رہے تھے کہ سمندر میں اچانک طوفان آگیا۔ اور ان کی کشتی اُلٹ گئی۔ بڑی مشکل سے تینوں ایک جزیرے پر پہنچے۔ ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ پہلا دوست اُکتا گیا۔ اُسے اپنے والدین کی یاد آنے لگی۔ دوسرے ہفتے دوسرا دوست بھی گھبرا گیا۔ اسے اپنے بیوی بچے یاد آنے لگے۔ تیسرا دوست بہ دستور خوش و خرم رہا۔ اُسے یہ نیا تجربہ اچھا لگا تھا۔ ایک دن تینوں ساحلِ سمندر کی سیر کر رہے تھے کہ ایک پرانا لیمپ ملا۔ پہلے نے اسے صاف کرنے کی غرض سے رگڑا تو اُس میں سے دھواں نکلنے لگا اور ایک جن نمودار ہوا اور بولا، "تم نے مجھے آزاد کیا ہے، میں تم تینوں کی ایک ایک خواہش پوری کروں گا۔"

پہلے دوست نے والدین کے پاس جانے کی خواہش کی اور وہ والدین کے پاس پہنچ گیا۔ دوسرا اپنی خواہش کے مطابق بیوی بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب تیسرے دوست کی باری تھی۔ وہ بولا، "ان دونوں کے بغیر میرا دل نہیں لگتا ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ۔"

کرن

مرسلہ: میمونہ رحمان، ساہیوال

آئیڈیل بننے سے بہتر ہے کہ خود بہت سے لوگوں کا آئیڈیل بننے کی کوشش کرو۔

معلومات عامّہ ۲۴۶

اس بار بھی سوالات کی تعداد بارہ ہی ہے، لیکن تصویریں صرف ۱۲ یا ۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی شائع کی جائیں گی۔ دس اور نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ جوابات ۱۵-اکتوبر ۸۶ء تک بھیج دیجیے۔ جوابات کے نیچے اپنا صاف نام اور پورا پتا لکھیے۔

۱۔ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال کی تھی، اُس وقت آپؐ کے کس بزرگ کا انتقال ہوا تھا؟

۲۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے کس عمر میں اسلام قبول کیا تھا؟

۳۔ نماز میں قیام کسے کہتے ہیں؟

۴۔ "ایک کیمیا داں کی عظمت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کچھ پڑھا ہے، بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا کچھ تجربے کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے۔" بتائیے یہ الفاظ کس سائنس داں کے ہیں؟

۵۔ تخت نشینی کے وقت سلطان محمود غزنوی کس علاقے کا حکم راں تھا؟

۶۔ بوم راست اقدام کب اور کس طرح سے منایا گیا تھا؟

۷۔ پروفیسر انجم اعظمی کی ایک کتاب کا نام "ادب اور حقیقت" ہے۔ کیا یہ مجموعۂ کلام ہے؟

۸۔ جوڈو اور کراٹے مارشل آرٹ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ "کنگ فو" بھی مارشل آرٹ ہی میں سے ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے "کنگ فو" کس ملک میں شروع ہوا تھا؟

۹۔ "ہم سورج، چاند، ستارے" رئیس فروغ مرحوم کی ایک کتاب کا نام ہے۔ کیا یہ کتاب سائنس کی ہے؟

۱۰۔ ہاکی کے کھیل کو دوبارہ کس سنہ میں اولمپک مقابلوں میں شریک کیا گیا تھا؟

۱۱۔ شہنشاہ ہمایوں کے والد کا پورا نام کیا تھا؟

۱۲۔ ایران کے موجودہ دارالحکومت کا کیا نام ہے؟

پینسل کی کہانی
خود اس کی زبانی

جہاں چلے، رواں چلے
شاہ سنز کی نئی گولڈفش آٹوگریٹ پینسل

پیارے بچّو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے سب سے پہلے کس نے اور کب تیار کیا؟
۵۹۷۱ء کی بات ہے۔ ایک فرانسیسی باشندے نے سب سے پہلے میرا سکّہ دریافت کیا۔ اس سکے میں گریفائٹ اور کلے کا محلول شامل ہوتا ہے جسے گرم بھٹی میں ایک ہزار فارن ہائٹ کے درجۂ حرارت پر گرم کیا جاتا ہے۔ اس گریفائٹ میں کاربن کی مقدار ۹۷ فیصد ہوتی ہے جبکہ کلے اسے مضبوطی سے جوڑنے کے لیئے استعمال ہوتی ہے۔ رنگین پنسلوں میں موم، تیل اور مختلف رنگ شامل کئے جاتے ہیں۔ پنسلوں میں استعمال ہونیوالی لکڑی کیلیفورنیا اور انڈونیشیا سے درآمد کی جاتی ہے

پاکستان میں ان پنسلوں کی تیاری کے لیئے **شاہ سنز** کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کی پنسلیں عالمی معیار کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ ان کا سکّہ مضبوط اور رواں ہوتا ہے۔
شاہ سنز کی نئی آٹوگریٹ پنسل کا تو جواب نہیں۔
ایک بار آزمانے کے بعد آپ اسے بار بار استعمال کریں گے،
دفتروں میں، اسکولوں میں، آرٹسٹ،
انجنیئرز، طالب علم سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔

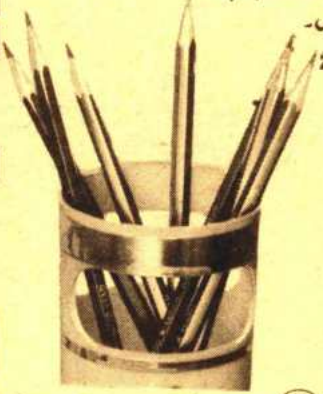

شاہ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی
فون : ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

چار دوست

کسی زمانے میں ایک کوّے، ایک گیدڑ، ایک لکڑ بگھے اور ایک اونٹ کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ سب جمع ہو کر غذا حاصل کیا کریں گے۔ اونٹ نے کوّے سے کہا، "دوست، تم اُڑ سکتے ہو، لہٰذا تم جاؤ اور چاروں طرف چکّر لگا کر دیکھو۔"

کوّا ایک درخت سے دوسرے درخت پر اُڑتے اُڑاتے ایک ایسے کھیت میں پہنچ گیا جہاں بڑے عمدہ خربوزے لگے ہوئے تھے۔ اس نے آکر اپنے دوستوں کو بتایا اور اونٹ سے کہا، "تم اس کے پتّے کھانا اور ہم اس کے پھل کھائیں گے۔"

جب رات ہو گئی تو یہ چاروں دوست اس کھیت پر پہنچے اور خوب پیٹ بھر کر کھانے لگے۔ اتنے میں اچانک کھیت کا مالک جاگ اُٹھا اور آ گیا۔ کوّا، گیدڑ اور لکڑ بگھا تو بھاگ گئے مگر اونٹ پکڑا گیا اور کسان نے اسے خوب ڈنڈوں سے مارا۔ بعد میں جب اونٹ اپنے دوستوں کے پاس پہنچا تو اس نے کہا، "تم لوگ کیسے دوست ہو کہ مجھ کو مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

یہ سُن کر گیدڑ بولا، "ارے بھئی، ہم گھبرا گئے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آج رات ہم تمھارے ساتھ رہیں گے اور تم کو مار کھانے نہ دیں گے۔"

دوسرے دن کسان نے اپنے کھیت کو بچانے کے لیے وہاں جال لگا دیے۔ آدھی رات کے قریب یہ چاروں دوست پھر وہاں پہنچے اور خربوزے کھانے لگے۔ کوّے، گیدڑ اور لکڑ بگھے نے تو جلدی جلدی اپنا پیٹ بھر لیا، مگر اونٹ کا پیٹ ابھی ذرا بھی نہیں بھرا تھا کہ اتنے میں گیدڑ بولا، "بھائی اونٹ، میرا دل چاہتا ہے کہ چلّاؤں۔" اونٹ نے جلدی سے کہا، "ارے ایسا غضب نہ کرنا، مالک آجائے گا۔ تم لوگ تو بھاگ جاؤ گے، مگر میری پٹائی ہو جائے گی۔" لیکن گیدڑ نہ مانا اور چیخنے لگا۔ اس کی آواز سُن کر مالک آپہنچا، لیکن

اتفاق سے ایسا ہوا کہ اونٹ، کوّا اور گیدڑ تو بھاگنے میں کامیاب ہو گئے مگر بے وقوف لکڑ بگھا جال میں پھنس گیا۔ وہ چلّانے لگا "دوستو! دوستو! کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟ میں مار ڈالا جاؤں گا!" یہ سُن کر کوّا چلّایا، "میری ہدایت پر عمل کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں کیا کروں؟" لکڑ بگھا چلّایا۔

"لیٹ جاؤ اور ایسے بن جاؤ کہ جیسے مر گئے ہو۔ کھیت کا مالک تم کو پھینک دے گا۔ اس کے بعد تم دوڑ کر بھاگ آنا۔" کوّا بولا۔

اتنے میں مالک آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لکڑ بگھا پڑا ہے۔ وہ سمجھا کہ یہ مر گیا ہے، چناں چہ اس نے لکڑ بگھے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ کر اسے گھسیٹا اور کھیت کے باہر پھینک دیا۔ باہر پہنچتے ہی لکڑ بگھا اُٹھ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ کسان نے جو یہ دیکھا تو اس کو بڑا غصّہ آیا۔ کہنے لگا، "ارے! یہ فریبی تو زندہ تھا!"

اس کے بعد جب یہ چاروں دوست پھر اکٹھے ہوئے تو اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "تمھارے چیخنے کی وجہ سے میری پھر پٹائی ہو گئی ہوتی۔ بہرحال خیر سے گزر گئی، لیکن یاد رکھو۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ آج تمھاری جیت ہے تو کل ہماری بھی ہو سکتی ہے۔" کچھ دنوں کے بعد اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "میں ذرا ٹہلتے جا رہا ہوں، اگر تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ تو میں تم کو بھی سیر کرا دوں گا۔ اس طرح سے تم دنیا دیکھ لو گے۔" گیدڑ راضی ہو گیا۔ اونٹ جھک گیا اور گیدڑ اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے یہ دونوں ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں کتّوں نے جو گیدڑ کو اونٹ کی پیٹھ پر دیکھا تو وہ بھونکنے لگے۔ اتنے میں اونٹ نے گیدڑ سے کہا، "میرا دل چاہتا ہے کہ ذرا زمین پر لوٹ لگا لوں۔"

"ارے ایسا غضب نہ کرنا۔" گیدڑ چلّایا۔ اس پر اونٹ بولا، "نہیں دوست، میں تو لوٹ ضرور لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر اونٹ زمین پر لیٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ گاؤں کے تمام کتّوں نے گیدڑ پر حملہ کر کے اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں۔ اس کے بعد اونٹ نے آ کر اپنے دوستوں کو بتا دیا کہ ان کے غدّار ساتھی کا کیا انجام ہوا۔ سب نے گیدڑ کے انجام کو درست قرار دیا۔

مُسکراتے رہو

★ ایک دفعہ ایک سردار جی تربیلا ڈیم دیکھنے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دوسرے ساتھی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار جی اپنے ساتھیوں سے بولے، "کیا زمانہ آگیا ہے۔ کوئی چیز خالص نہیں ملتی۔ ایک پانی خالص تھا مگر اب اس میں سے بھی بجلی نکال لی ہے۔"

★ اسلم: داداجان! بچوں کا اخبار پڑھ کر مجھے بھی دیجیے گا۔

داداجان: بیٹا، یہ تمھارے پڑھنے کی چیز نہیں یہ تو بچوں کا اخبار ہے۔

مرسلہ: مجیب ظفر انوار، کراچی

★ ہوٹل میں بہت گرمی تھی۔ ایک گاہک نے اپنا کوٹ ایک جگہ ٹانگ دیا اور اس پر ایک پرچہ لگا دیا کہ کوئی میرا کوٹ نہ چرائے۔ میں باکسنگ کا عالمی چیمپئن ہوں۔" تھوڑی دیر بعد دیکھا تو کوٹ غائب تھا اور دوسرے پرچے پر تحریر تھا:

"کوئی مجھے پکڑنے کی کوشش نہ کرے میں بھی دوڑ کا عالمی چیمپئن ہوں۔"

مرسلہ: طارق وہاب خانزادہ، نصرپور

★ امتحان میں سوال آیا: "ثابت کریں کہ زمین گول ہے۔" ایک لڑکے نے جواب لکھا:

"جی زمین گول ہے۔ کھڑے ہو کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ بیٹھ کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ چھت پر سے دیکھیں تو زمین گول ہے۔ سائکل پر چڑھ کر دیکھیں تو زمین گول ہے۔ جی، اگر زمین گول ہے تو پھر یہ گول ہے۔"

ممتحن نے پرچہ دیکھتے ہوئے لکھا: "برخوردار، عینک لگا کر دیکھو یا اُتار کر دیکھو، نمبر بھی گول ہے۔"

مرسلہ: طاہرہ سلطانہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ

★ ایک شخص کو ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت تھی۔ ایک دن وہ گھر آئے تو انھیں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہ آئی۔ بہت جھنجلائے۔ اچانک ان کی نظر بیوی پر پڑی۔ بولے، "بیگم، بہت فضول خرچ ہوتی

جا رہی ہو۔"

بیگم نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

وہ صاحب جھٹ بولے، "بھئی جب ایک چوٹی سے کام چل سکتا تھا تو دو چوٹیوں کی کیا ضرورت تھی؟"

مرسلہ: بابر سلیم، غازی چک

★ ایک فقیر نے ایک آدمی سے پیسے مانگے تو اس آدمی نے کہا، "میں اپنی داڑھی پر تین مرتبہ ہاتھ پھیرتا ہوں۔ جتنے بال میرے ہاتھ میں آئیں گے اتنے ہی رُپے میں تمھیں دے دوں گا۔" اس آدمی نے تین بار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، لیکن کوئی بھی بال ہاتھ نہ آیا تو وہ فقیر سے بولا، "تیری قسمت میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

فقیر بولا، "یوں نہیں حضور، داڑھی آپ کی اور ہاتھ میرا۔ پھر دیکھیے میری قسمت۔"

★ ایک شخص نے جیب کترے کو عین اُس وقت پکڑ لیا جب وہ جیب کاٹ کر فرار ہو رہا تھا۔ اس شخص نے کہا، "تمھیں شرم نہیں آتی میری جیب کاٹتے ہوئے؟"

"شرم تو آپ کو آنی چاہیے۔ اتنا قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے، مگر جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔" جیب کترا بولا۔

مرسلہ: محمد سجاد اصغر، شاہدرہ

★ ایک دن مُلّا نصر الدین سے لوگوں نے کہا، "مُلّا آپ اپنے کو ولی کہتے ہیں، کوئی ثبوت تو دیں۔" ملّا کہنے لگے، "میں جس چیز کو بھی بُلاتا ہوں وہ میرے پاس آجاتی ہے۔"

لوگوں نے مُلّا سے کہا، "اچھا یہ جو سامنے درخت ہے، آپ اس کو اپنے پاس بُلائیں تو جانیں۔" ملّا نے درخت کو تین دفعہ اپنے پاس آنے کا حکم دیا۔ جب درخت نہیں آیا تو خود اُٹھ کر درخت کے پاس چلے گئے۔ لوگوں نے کہا، "آپ درخت کے پاس کیوں چلے گئے؟"

ملّا نے جواب دیا، "ولیوں میں غرور نہیں ہوتا جب درخت ہمارے پاس نہیں آیا تو ہم خود چلے گئے۔"

مرسلہ: ایس نعیم الدین نجمی، لیاقت آباد

★ باپ نے اپنے سست اور کاہل بیٹے سے کہا، "اب میں تمھارے لیے ایسا انتظام کروں گا کہ بٹن دباتے ہی ہر چیز تمھارے سامنے حاضر ہو جائے گی، جیسے ہی بٹن دباؤ گے کھانا آجائے گا، بٹن دباتے ہی جوتے تمھارے سامنے آجائیں گے، بٹن دباتے ہی....."

"لیکن ڈیڈی،" لڑکے نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "یہ بٹن دبائے گا کون؟"

مرسلہ: ارسلا خاں، کراچی

★ گاہک: (دُکان دار سے) مجھے غالب کے خطوط درکار ہیں۔

دُکان دار: خطوط کے لیے سامنے ڈاک خانے سے رجوع کیجیے۔

مرسلہ: بُشریٰ ظفر انوار، کراچی

★ ڈاکٹر: (نوکر سے) "دیکھو اکرام، باہر کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

اکرام: "حضور کوئی مریض ہوگا۔"

ڈاکٹر: "جاؤ معلوم کر کے آؤ مریض نیا ہے یا پرانا؟"

اکرام: "جناب، نیا ہی ہوگا، پرانا مریض تو ہمارے ہاں کبھی واپس ہی نہیں آیا۔"

مرسلہ: زوبار یہ شاہین بھٹی، سرگودھا

★ ایک کنجوس کی بیوی مرنے کے قریب تھی۔ کئی دن وہ اپنی بیوی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ آخر ایک دن یہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا:

"میں کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں، جلد آجاؤں گا، اگر میری غیر موجودگی میں خدانخواستہ موت آجائے تو مرنے سے پہلے لیمپ اور ہیٹر بجھا دینا۔"

مرسلہ: عظمیٰ کریم بھٹی، سرگودھا

★ ایک لیڈر صاحب جن کا ایک کان کسی حادثے میں کٹ گیا تھا۔ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ دورانِ تقریر وہ سینے پر ہاتھ مار کر بڑے جوش سے بولے،

"میں قوم کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

مجمع میں سے آواز آئی:

"صاحب، کن کٹے کی قربانی جائز نہیں۔"

مرسلہ: محمد مفیض الدین، کراچی

★ تیز کار چلانے کے جرم میں جج نے ایک مال دار شخص کو جو سزا دی وہ پانچ سو روپے جرمانہ یا پندرہ روز قید تھی۔ مجرم نے قید کو قبول کیا اور پانچ سو روپے جرمانے کی ادائیگی پسند نہ کی۔ لوگوں کو پتا چلا تو وہ اسے کنجوسی کا طعنہ دینے لگے۔ مال دار شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، "بھئی آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ دراصل میری بیوی نے مجھے بتا دیا تھا کہ نیا بادرچی پندرہ روز کے بعد آئے گا۔"

★ لندن میں ایک اسٹیج ڈراما مقبولیت کے رکارڈ قائم کر رہا تھا۔ ایک سال پہلے لوگوں کو اس کے ٹکٹ بُک کرانے پڑتے تھے۔ ایک صاحب تھیٹر ہال میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوئے کہ ان کے برابر کی سیٹ پر ایک خاتون بیٹھی ہیں اور اس سے اگلی سیٹ خالی ہے۔ ان صاحب نے خاتون سے خالی سیٹ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی، "جناب، یہ سیٹ میرے خاوند کے لیے بک تھی، لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

وہ صاحب ازراہِ ہمدردی بولے، "تو پھر آپ کو یہ ٹکٹ اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو دے دینا چاہیے تھا۔"

خاتون بولی، "مجبوری تھی جناب، کیوں کہ آج سب لوگ میرے خاوند کے کفن دفن میں مصروف ہیں۔"

مرسلہ: سید غضنفر رضا، میرپور خاص

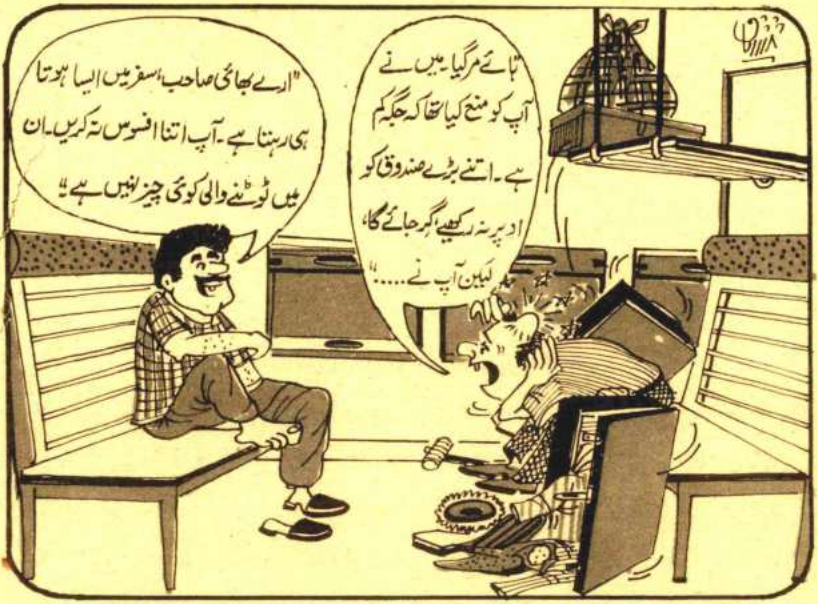
ہائے مرگیا۔ میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ جگہ کم ہے۔ اتنے بڑے صندوق کو اوپر نہ رکھیے، گر جائے گا، لیکن آپ نے.....
"ارے بھائی صاحب، سفر میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ اتنا افسوس نہ کریں۔ ان میں ٹوٹنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔"

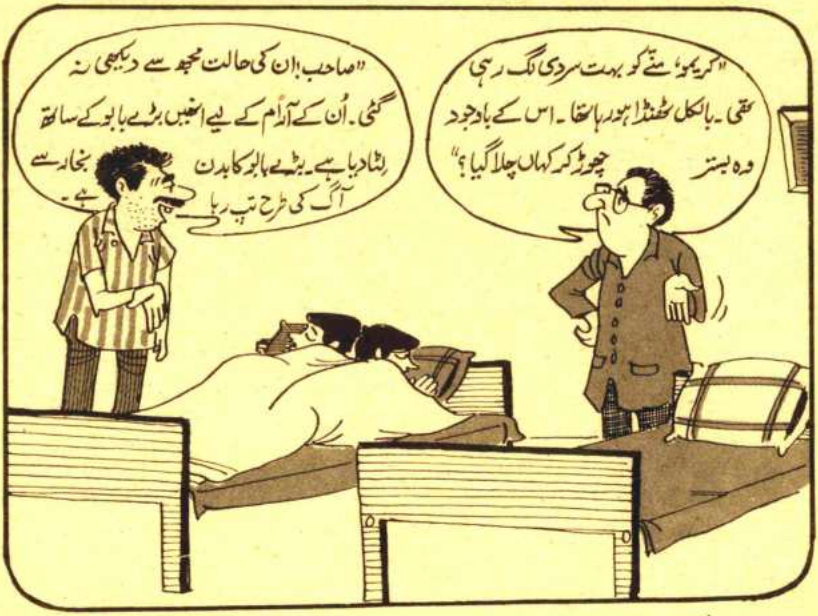
"کریمو، منے کو بہت سردی لگ رہی تھی۔ بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بستر چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟"
"صاحب! ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اُن کے آرام کے لیے انھیں بڑے بابو کے ساتھ لٹا دیا ہے۔ بڑے بابو کا بدن بخار سے آگ کی طرح تپ رہا ہے۔"

وارث کی تلاش

مناظر صدیقی

پرانی حویلی کی اصل عمارت کے قریب بے ترتیب جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ یہ حصّہ اچھا خاصا جنگل معلوم ہوتا تھا۔ شاید برسوں سے اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ صفائی کرتا بھی کون؟ خداداد خاں کو دنیا کی کسی چیز سے دل چسپی ہی نہیں رہی تھی۔ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ انھیں عمارت تک پہنچنے کا راستہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ طارق اور حبیب جھاڑیوں کے پاس رُک کر سوچنے لگے کہ عمارت تک خود خداداد خاں ضرور آتے جاتے ہیں لہٰذا کسی جگہ کوئی راستہ بھی ہوگا۔ جھاڑیوں میں گھس کر نکلنا تو ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ مکان پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ حبیب عمارت اور جھاڑیوں کی اس حالت کو دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اُس نے طارق سے کہا:

"عمارت تک پہنچنا آسان نہیں۔ جھاڑیوں میں سانپ بچھو بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔"

طارق نے کہا، "عمارت تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ ایک تو ہمیں عمارت کے دروازے بند کرنے ہیں۔ دوسرے میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس عمارت کے متعلق لوگ جو باتیں کرتے ہیں، ان میں سچّائی بھی ہے یا نہیں۔"

"کیا باتیں کرتے ہیں؟" حبیب نے پوچھا۔

"میں نے تمھیں بتایا تھا کہ اس عمارت کا مالک ایک بوڑھا آدمی ہے۔ یہاں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ اس کے مالک خدا داد خاں بہت کنجوس آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری دولت اس عمارت میں کہیں چھپا رکھی ہے اور حویلی کی اوپری منزل پر بھوت رہتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اس عمارت میں کہیں خزانہ چھپا ہوا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تم عمارت کے اندر بھی جاؤ گے؟" حبیب نے پوچھا۔

"ہاں، میرا ارادہ تو ہے۔" طارق نے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو بہت بُری بات ہے۔ کسی کے مکان میں مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونا جرم ہے۔ اس میں تو ہمیں پولیس گرفتار بھی کر سکتی ہے۔ بھئی میں تو ہرگز مکان کے اندر نہیں جاؤں گا۔" حبیب نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

طارق نے سمجھایا، "ہم کسی بُرے ارادے سے اندر نہیں جائیں گے۔ فرض کرو کہ مکان میں سچ مچ خزانہ موجود ہے اور لوگوں کے خیال کے مطابق لاکھوں رُپے ہیں تو خدا داد خاں کے بیمار ہونے کی وجہ سے ان رُپوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمیں اگر یہ خزانہ مل گیا تو ہم اسے حویلی ہی میں اچھی طرح چھپا دیں گے اور حویلی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں گے۔ اس طرح یہ رقم محفوظ ہو جائے گی۔ پھر جب خدا داد خاں صاحب تن درست ہو کر لوٹیں گے تو انھیں بتا دیں گے ہم نے ان کی دولت کی صرف حفاظت کی ہے۔ کنجوس آدمی اپنی دولت کی حفاظت ہی چاہتا ہے۔ خاں صاحب بھی اس بات سے خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کی حویلی اور ان کی دولت کی حفاظت کی ہے۔"

"نہیں بھئی خزانہ تلاش کرنے والی بات ٹھیک نہیں۔ ہم بس حویلی کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اس عمارت کو محفوظ کر دیں گے اور واپس چلے آئیں گے۔ اگر تمھیں یہ بات منظور ہے تو میں تمھارے ساتھ چلوں گا ورنہ میں واپس جا رہا ہوں۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔" حبیب نے قطعی فیصلہ سُنا دیا۔

"تم خزانہ تلاش نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔ میرا تو خیال تھا کہ خزانہ تلاش کرنا ایک دل چسپ کام ہو گا، لیکن تم تیار نہیں تو میں بھی تلاش نہیں کروں گا۔" طارق نے کہا۔

دونوں نے عمارت تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد جب انھیں جھاڑیوں کے بیچ میں ایک پتلا سا راستہ مل گیا تو وہ اصل عمارت تک پہنچے۔ دونوں نے سب سے پہلے صدر دروازے کی طرف رُخ کیا، لیکن انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ دروازے کی کنڈی نہیں لگی تھی، لیکن دروازہ بند تھا۔ طارق نے دروازے کو ہلایا جُلایا تو اُسے اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر کی طرف سے بند ہے۔ کسی نے اندر کی چٹخنی چڑھا دی ہے۔

"دروازے کے اندر کی چٹخنی لگی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اندر موجود ہے۔"

طارق نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ خاں صاحب لوٹ آئیں ہوں۔" حبیب نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں یہ ممکن نہیں، کیوں کہ ابّو انھیں آج ہی بے ہوشی کی حالت میں ٹھٹھہ کے ہسپتال پہنچا کر آئے ہیں۔ اتنی جلدی وہ ٹھٹھہ سے تن درستی کی حالت میں بھی واپس نہیں آسکتے، کیوں کہ ان کے پاس کار نہیں ہے اور بس صرف دو وقت صبح اور شام کو آتی ہے۔" طارق نے سمجھایا۔

"پھر کوئی چور ہو گا۔ ہمیں فوراً واپس ہو جانا چاہیے۔" حبیب نے کہا۔

"اگر واقعی کوئی چور اندر گھس گیا ہے تو پھر ہمارا یہاں رُکنا اور چور کو گرفتار کرانا ضروری ہے، کیوں کہ خاں صاحب کا کوئی رشتے دار تو ہے نہیں۔ ان کے گھر کی حفاظت ہم پڑوسی ہی کر سکتے ہیں۔"

"لیکن چور تو جان سے بھی مار دیتے ہیں۔ ہم انھیں کیسے پکڑیں گے؟" حبیب شاید چوروں سے ڈرتا تھا۔

"ہمیں پکڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم چھپ کر چور کو دیکھیں گے۔ جب وہ یہاں سے

نکلے گا تو ہم چھپ کر اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر ہم نے اس کا گھر یا اس کا اڈّا دیکھ لیا تو بعد میں اسے گرفتار کرانا آسان ہوگا، ورنہ ہم کم سے کم اس کی شکل تو دیکھ ہی لیں گے۔ اس طرح ہم اپنے بڑوں کو یا پولیس کو اس کا حلیہ بتا سکیں گے۔ پھر وہ چور پکڑ لیا جائے گا۔" طارق نے سمجھایا۔

حبیب دل میں تو ڈر رہا تھا، لیکن وہ اکیلے واپس جاتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ اُسے یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ طارق ضرور وہیں رُکے گا، اس لیے مجبوراً خاموش ہو رہا۔ طارق نے حبیب کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کی پچھلی طرف چلنے لگا۔ یہاں کئی کھڑکیاں تھیں جن میں شیشہ لگا تھا، لیکن تمام شیشوں پر اتنی دھول جمی تھی کہ اندر کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کئی کھڑکیوں کو دھکا دیا۔ وہ اس طرح بند تھیں کہ دھکا دینے پر کُھل تو جاتیں، لیکن اس سے زور دار آواز پیدا ہوتی۔ طارق نے ان کھڑکیوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ کئی کھڑکیوں کو آزمانے کے بعد آخر ایک کھڑکی ایسی مل گئی جو ذرا سا دھکا دیتے ہی آسانی سے کسی آواز کے بغیر کُھل گئی۔ طارق نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ شاید باورچی خانہ تھا، لیکن یہ بھی شاید برسوں سے استعمال نہیں ہوا تھا، کیوں کہ اس میں بھی ہر طرف کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ برتن اِدھر اُدھر لڑھکے پڑے تھے۔ دیواروں پر مکڑیوں نے جالے تن رکھے تھے۔ ذرا سی کوشش سے طارق کھڑکی پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے حبیب کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ حبیب اندر تو نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن باہر تنہا کھڑے رہتے ہوئے بھی اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً وہ بھی طارق کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔

دونوں دوست خاموشی سے اندر اُتر گئے۔ طارق آگے آگے تھا اور حبیب پیچھے پیچھے۔ حویلی اندر سے خاصی بڑی تھی۔ نچلی منزل پر کئی کمرے تھے۔ وہ کسی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے آہٹ لیتے کہ اندر کوئی ہے تو نہیں۔ انھوں نے جتنے کمرے بھی دیکھے وہ سب دُھول سے اَٹے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کا کمرا خاصا بڑا تھا۔ اس میں صوفے بھی پڑے تھے، لیکن اُن پر بھی اتنی دُھول تھی کہ اُن پر بیٹھنا تو کیا ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ کئی کمروں کو دیکھنے کے بعد وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو سونے کا کمرا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کمرا دوسرے کمروں کے مقابلے میں کچھ صاف تھا۔ اس میں ایک طرف پرانے اخبارات کا ڈھیر جمع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی برس کی ردّی جمع ہو۔ یہاں ایک مسہری بھی تھی، لیکن اس پر بچھا

ہوا بستر میلا تھا۔ جیسے اس پر سونے والا اسے کبھی صاف نہ کرتا ہو۔ دیوار پر کسی عورت کا ایک لمبا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ دھول کی وجہ سے اس کا رنگ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کوٹ کے برابر ہی دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک میز پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ ان پر دھول نہیں تھی شاید خاں صاحب یہ کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ مسہری کے برابر ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک لڑکا سو رہا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکا خاصا پریشان ہے۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ دری کے کنارے رکھے ہوئے اس کے جوتوں پر پالش بھی نہیں تھی، لیکن لڑکے کے برابر ایک بندوق رکھی ہوئی تھی اور سرہانے چاندی کا ایک مگ رکھا ہوا تھا۔ طارق اور حبیب نے اس لڑکے کو غور سے دیکھا، لیکن دونوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ حبیب کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ طارق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ میز کی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کوئی ایسی ڈائری مل جائے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ خاں صاحب کا کوئی رشتے دار بھی ہے یا نہیں اور انھوں نے جو دولت جمع کر رکھی ہے وہ کہاں چھپائی ہے۔ ڈائری تلاش کرنے کی کوشش میں ایک کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ کتاب گرنے کی آواز سے دری پر سوئے ہوئے لڑکے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی اپنی بندوق سنبھال لی۔ اس وقت اس کے سامنے حبیب تھا۔ طارق کی طرف تو اس کی پیٹھ تھی۔ اس لیے اس نے حبیب پر بندوق تان کر سخت لہجے میں پوچھا: "تم کون ہو؟ چوری کرنے گھسے تھے؟"

"نن... نن.... نہیں.... نہیں....!" بندوق دیکھ کر حبیب گھبرا گیا۔

"پھر کیوں آئے تھے؟" لڑکے نے اور زیادہ سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ.... وہ.... ہم.... ہم....!" حبیب بندوق دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگا تھا لیکن اتنی دیر میں کتاب کے گرنے سے طارق پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے اوسان پر قابو پا چکا تھا۔ اُس نے بھی اُسی لڑکے کی طرح سخت لہجے میں کہا:

"ہم تو پڑوس ہی میں رہتے ہیں، لیکن تم بتاؤ تم کون ہو۔ خاں صاحب تو اپنی حویلی میں تنہا رہتے ہیں۔ تم یہاں کیسے گھسے اور یہاں خالی مکان میں چھپ کر کیوں سو رہے تھے؟"

طارق کے اس طرح سخت لہجے میں سوال کرنے سے وہ لڑکا پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی

بندوق نیچی کر لی اور اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا، "میرا نام جمیل ہے۔ خداداد خاں صاحب میرے تایا ہیں، یعنی میرے والد نبی داد خاں کے بڑے بھائی۔ میں اپنے تایا کے پاس رہنے آیا ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے گھر سے بھاگ آئے ہو اور یہ مکان خالی دیکھ کر تم یہاں چھپ گئے۔ تمہارا حلیہ بتا رہا ہے کہ تم اپنے ماں باپ کی اجازت سے یہاں نہیں آئے۔" طارق نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں، لیکن یہ بات میں نے جھوٹ نہیں کہی کہ خداداد خاں صاحب میرے تایا ہیں۔" جمیل نے کہا۔

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم دونوں کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور تم یہاں کیوں آئے تھے؟" جمیل نے پوچھا۔

طارق نے اپنا اور حبیب کا تفصیلی تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ خاں صاحب ٹھٹھے کے ہسپتال میں داخل ہیں اور بے ہوش ہیں۔ خاں صاحب کی بیماری کے متعلق سُن کر جمیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا:

"شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔ میں بہت چھوٹا سا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ امی مجھے لے کر نانا کے پاس چلی گئیں۔ نانا ان دنوں خود بھی بیمار تھے اور بوڑھے بھی تھے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے امی کی دوسری شادی کرا دی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد نانا کا بھی انتقال ہو گیا۔ میرے سوتیلے باپ کی عادتیں اچھی نہیں ہیں۔ وہ مجھ پر شروع ہی سے بہت ظلم کرتا ہے۔ امی یہ ظلم دیکھتی رہتی، لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں، لیکن میری حالت اور ذرا ذرا سی بات پر میری پٹائی سے انھیں دُکھ پہنچتا تھا۔ وہ اُسے برداشت نہیں کر سکیں، جلد ہی وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ امی کے انتقال کے وقت میری عمر صرف دس سال تھی۔ وہ مرتے وقت مجھ سے کہہ گئی تھیں مجھے جب بھی موقع ملے میں اپنے تایا کے پاس چلا جاؤں۔ عمر کم ہونے کی وجہ سے امی کے انتقال کے بعد میں یہاں نہیں آسکا۔ اب ساڑھے پانچ سال بعد مجھے جیسے ہی موقع ملا میں یہاں چلا آیا، لیکن تم لوگ کہہ رہے ہو کہ تایا میرے پہنچنے سے پہلے ہی بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو نہ جانے وہ کب تک اچھے ہوں گے۔ اتنے دنوں کے لیے مجھے کوئی نوکری تلاش کرنی پڑے گی، کیوں کہ تایا نہیں ہوں گے تو مجھے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

جمیل کی داستان سُن کر جمیب اور طارق کو بہت دکھ ہوا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن طارق کو جلد ہی خیال آگیا کہ صرف آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے ابّو اور امی نے اکثر اُسے سمجھایا تھا کہ کسی مصیبت یا مشکل میں رونے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ انسان کو چاہیے کہ مصیبت کو ختم کرنے کے لیے یا مشکل کو آسان بنانے کے لیے عقل سے کام لے اور مشکل سے نکلنے کی کوشش کرے۔ چناں چہ اس نے جمیل سے کہا:

"تمھیں رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک خاں صاحب صحت پا کر واپس نہیں آجاتے اس وقت تک تو تم یہاں اطمینان سے رہو۔ کھانے پینے کی فکر نہ کرو۔ ہم اس کا انتظام کر دیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس وقت بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں؟"

"میں نے تو کچھ نہیں کھایا، لیکن تم میرے کھانے پینے کا انتظام کیسے کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب تک تایا تن درست ہو کر واپس نہ آجائیں اس وقت تک کسی کو یہ پتا چلے کہ میں یہاں موجود ہوں، کیوں کہ بات ایک سے دوسرے کو معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی طرح

بھی میرے سوتیلے باپ کو پتا چل گیا کہ تایا بیمار ہیں اور میں یہاں موجود ہوں تو وہ آکر مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا اور میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ کسی بھی حالت میں واپس نہیں جاؤں گا۔" جمیل نے بتایا۔

حبیب بولا، "اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ مجھے ابّو اور امّی نے یہاں چھوڑا ہی اس لیے ہے کہ میں یہاں آرام کروں۔ تفریح کروں تاکہ میری صحت اچھی ہو جائے۔ میں اپنے خانساماں سے روزانہ جنگل میں پک نک منانے کے بہانے کھانا لے آیا کروں گا۔"

طارق نے کہا، "ترکیب تو اچھی ہے۔ تم آج بھی کسی ترکیب سے جمیل کو کھانا پہنچا دو۔"

"ہم ابھی تھوڑی دیر میں کھانا پہنچا دیں گے۔" حبیب نے کہا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انھیں ایک چیخ سنائی دی۔ یہ کسی بچّے کی چیخ تھی۔ تینوں اٹھ کر کھڑکی کے قریب پہنچے۔ اسی وقت دوسری چیخ سنائی دی۔ کوئی بچّہ طارق کا نام لے کر چیخ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچّہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ یا کسی چیز سے ڈر کر چیخ رہا ہے۔ طارق بولا، "یہ تو مُنّو کی آواز ہے، لیکن وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

طارق اور حبیب جلدی سے باورچی خانے میں پہنچے اور کھڑکی پھلانگ کر جھاڑیوں کی طرف دوڑے۔ جمیل بھی اپنی بندوق لیے ان کے پیچھے چلا، لیکن وہ طارق اور حبیب سے کچھ فاصلے پر ہی رہا، تاکہ اگر اس کے لیے کوئی خطرہ ہو تو فوراً چھپ جائے۔

مُنّو کو تلاش کرتے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ جھاڑیوں کے پار ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ طارق نے جب اس کے قریب پہنچ کر اس سے پوچھا کہ وہ کس سے ڈر کر چیخا تھا تو مُنّو کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا، "تمھیں بلانے کے لیے۔ مجھے معلوم تھا تم میلی چیکھ سُن تل پھولن آجاؤ گے۔" (تمھیں بُلانے کے لیے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری چیخ سُن کر فوراً آجاؤ گے۔)

"تم بہت گندے بچّے ہو۔" طارق نے ناراض ہوتے ہوئے کہا، "تم نے ہم کو ڈرا دیا۔"

اس جملے پر مُنّو اور زیادہ زور سے ہنسنے لگا۔ پھر جب طارق نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا تو اس نے اپنی توتلی زبان میں بتایا کہ اسے بھوک لگی تھی اس لیے وہ حبیب کے ملازم سے گھر جانے کا کہہ کر گھر چلا گیا تھا، لیکن گھر پر امی نے بتایا کہ ابھی کھانا تیار نہیں ہے تو وہ طارق اور حبیب کو تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ دونوں پرانی حویلی کی طرف آئے ہیں۔

منتخب کہانیاں

خاص نمبر (ستمبر ۸۶ء) میں انعامی کہانیوں کا اعلان کیا گیا۔ اس میں جو کہانیاں اول، دوم اور سوم آئی تھیں وہ فروری ۸۶ء میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ پندرہ اچھی کہانیوں میں سے دو کہانیاں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔ باقی آیندہ شائع کی جائیں گی۔

کیسا انصاف ہے

ایلیزا جونیجو، لاڑکانہ

کار ایک جھٹکے کے ساتھ کالج کے دروازے کے سامنے رُکی۔ ڈرائیور تیزی سے باہر آیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ریٹا بڑی شان سے باہر نکلی اور اپنے شانوں تک کٹے بالوں کو جھٹکا دے کر اپنا خوب صورت کالے رنگ کا پرس سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

ریٹا ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی تھی۔ غرور کا مادّہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ شہر کے ایک نہایت اچھے اسکول میں پڑھتی تھی، مگر صرف نام کے لیے۔ وہ اسکول سال میں صرف اکیس بائیس دن جاتی تھی۔ یہ بھی ان دِنوں میں سے ایک دن تھا۔ وہ لان سے گزر کر برآمدے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنی گھڑی میں دیکھا دس بج رہے تھے۔ اچانک اس کی نظر مس نعیمہ پر پڑی۔ مس نعیمہ اسے دیکھ کر اُچھل پڑیں، "ارے ریٹا تم؟ اس دفعہ تو بہت دیر کر دی۔" مس نعیمہ شوخی سے بولیں۔

"بس کیا کروں، ہماری بھی اتنی بڑی لائف ہے کہ بس۔" ریٹا نے اپنے ہاتھوں کو نچا کر جواب دیا۔

"ہاں یہ بات تو ہے اور بتاؤ ممی کیسی ہیں؟" مس نعیمہ نے چہک کر کہا۔

"ارے ممّا! اُن کو پارٹیز سے فرصت ملے تو وہ کچھ ہوں بھی۔" ریٹا نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے یہ انگوٹھی تو بہت اچھی ہے۔" مس نعیمہ نے تجسّس آمیز لہجے میں کہا۔

"ایے یہ تو پاپا فرانس سے لائے تھے۔ ڈائمنڈ کی ہے۔" ریٹا بولی، "اچھا اب میں جاؤں؟" اتنے میں ہیڈ مسٹریس آگئیں اور مس نعیمہ رفوچکر ہوگئیں۔

"ہیلو ریٹا، کیا حال ہے؟" ہیڈ مسٹریس صاحبہ بولیں۔

"ٹھیک ہوں آنٹی۔" ریٹا نے جواب دیا۔

"زرین کیسی ہے؟" ہیڈ مسٹریس نے خوش دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہیں ممّا بھی۔" ریٹا نے منہ بنایا۔

"ارے چلو، میں تمھیں کلاس تک چھوڑ آؤں۔"

"اوہ تھینکس!" ریٹا نے قدم اٹھایا۔

وہ کلاس روم کی طرف چل پڑیں۔

ریٹا نے کلاس میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی اور اندر داخل ہو گئی۔ مس پروین نے اسے محسوس تو کیا، مگر کچھ نہ بولیں البتہ کلاس کی لڑکیوں نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ مس پروین کو آہستہ سے کچھ کہہ کر چلی گئیں۔

"کیا حال ہیں بھئی؟" ریٹا نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی شازیہ سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شازیہ جواب دیتی مس پروین نے کہا "سب لڑکیاں میری طرف متوجہ ہوں۔ جیسا کہ کل میں نے سب سے کہا تھا اپنے کیمسٹری کے جرنل فیئر کر کے لائیں، اس لیے اب میں چیک کرنے کے لیے آ رہی ہوں۔"

"کیا مصیبت ہے۔" ریٹا نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے ریٹا؟ کیا تم جرنل نہیں لائیں؟" مس پروین نے پوچھا۔

"میرا جرنل فیئر نہیں ہے۔" ریٹا نے جواب دیا۔

"لیکن آخر کیوں؟ ریٹا تم اسکول آتی بھی کم ہو اور اوپر سے کام بھی نامکمل چھوڑ دیتی ہو۔ آخر کیوں؟"

"کر لوں گی کام۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔" ریٹا نے تلملا کر جواب دیا۔

"آخر حد ہوتی ہے بدتمیزی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم آخر کیا چاہتی ہو؟" مس پروین نے کہا۔

"میں جو کچھ چاہتی ہوں سمجھ میں نہیں آئے گا تمھارے۔" ریٹا نے سخت لہجے میں کہا۔

"لڑکی، تم گستاخ ہوتی جا رہی ہو۔" مس پروین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ابھی تمھارا بندوبست کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر ریٹا کلاس روم سے باہر نکلی اور تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ چپراسی اُسے روکتا ہی رہ گیا۔ "آنٹی، یہ آپ نے کس قسم کی مس پالی ہے۔ نہ بولنے کا ڈھنگ اور نہ کسی کی عزت کرنے کا سلیقہ۔ چلی ہیں پڑھاتے۔ آپ کو اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"چلو بھئی! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ہاں، شاید تمھارا اشارہ پروین کی طرف ہے۔ میں ابھی اس کا بندوبست کروائے دیتی ہوں۔" ہیڈ مسٹریس صاحبہ بولیں۔

"تھینک یو آنٹی، تھینک یو ویری ویری مچ۔" ریٹا نے کہا۔ اور وہ دونوں چل پڑیں۔ کلاس میں داخل ہو کر ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے مس پروین کی طرف غصّے سے دیکھا اور بولیں،

"جو کچھ میں نے سُنا ہے کیا یہ درست ہے؟ اسی لیے تم پڑھاتی ہو کہ طالبات کو سمجھانے کے بجائے اُلٹا الجھاؤ؟ تمھیں معلوم ہے اگر ریٹا کی ممّی کو پتا چل گیا تو نہ تمھاری نوکری رہے گی اور نہ عزت۔ بہتر یہ ہے کہ تم ان سے معافی مانگو، ورنہ تمھاری ملازمت ختم سمجھو۔"

مس پروین سر جھکائے سُنتی رہ گئیں اور سوچتی رہ گئیں کہ "یہ کیسا قانون ہے، یہ کیسا ظلم ہے، یہ کیسا انصاف ہے۔"

ناقابلِ فراموش

طارق محمود قاضی، عطّار

موسم بہار کا خوش گوار دن تھا۔ نیلگوں آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل بڑا خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ سائنس بلاک کے سامنے سبزہ زار میں رنگ برنگے پھول بادِ بہار سے اس طرح جھوم رہے تھے جیسے ایک دوسرے سے گلے مِل رہے ہوں۔ سفید پتھّر کے بنے ہوئے خوب صورت بنچوں پر کالج کے لڑکے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کالج میں خالی پیریڈ لڑکوں کے لیے خوشی کا پیغام ہوتا ہے، کیوں کہ فارغ وقت میں انھیں نہ صرف گپیں مارنے کا، بلکہ ذہن کو تازہ دم کرنے کا موقع بھی ملتا ہے، لیکن جمیل کے لیے تو یہ چالیس منٹ وبالِ جان ہوتے۔ وہ عموماً کھویا کھویا سا رہتا اور خالی پیریڈ اس کی اضطرابی کیفیت کو مزید بڑھا دیتے۔ آج بھی انگریزی کا پیریڈ خالی تھا۔ جمیل بہت مضطرب تھا۔ وہ کمرے سے نکلا اور لان کے ایک کارنر میں خالی بنچ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی کھویا کھویا نظر آرہا تھا۔ آج اسے اپنا ماضی شدّت سے یاد آرہا تھا۔ ماضی کے تمام واقعات اس کے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگے۔ اس نے اپنے جسم کو کسی بے جان چیز کی مانند بنچ پر گرا دیا اور ماضی کے واقعات میں محو ہو گیا۔ اس کا کوئی دوست تو تھا نہیں جسے وہ یہ واقعات سُنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔

اس نے جس گھر میں آنکھ کھولی تھی اس کی دیواروں پر ہر وقت مفلسی کے سائے رقصاں رہتے تھے۔ اس کا بابا مزدوری کرتا تھا اور دن بھر کی مشقت کے بعد اتنے پیسے ملتے کہ دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔

اس کی دو بڑی بہنیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ خاندان میں ایک چچا اور پھوپھی بھی تھے، لیکن ان کی حالت بہتر تھی۔ اس وجہ سے وہ اپنے بھائی اور اس کی اولاد سے آنکھ ملانا گوارا نہیں کرتے تھے۔

وہ جب پانچ برس کا ہوا تو بابا اسے اسکول لے گئے۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور محنتی تھا، اس لیے جلد ہی تمام اساتذہ اسے پسند کرنے لگے۔ اسی محنت اور ذہانت کی بنا پر وہ بہت جلد تعلیمی مدارج طے کرنے لگا۔ وہ ہر سال کلاس میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کرتا۔ اب وہ مڈل میں پہنچ چکا تھا۔ یہ اس کے لڑکپن کا دور تھا، لیکن وہ بجائے کھیل کود اور آوارہ گردی کے ہر وقت کتابوں میں مگن رہتا۔ آٹھویں جماعت میں تعلیمی اخراجات بہ تدریج بڑھ گئے۔ اس لیے اب اس کے بابا کو زیادہ کام کرنا پڑتا۔ کام بڑھ جانے سے اس کے بابا کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کے بہتر مستقبل کے خواب اُن کی حوصلہ افزائی کرتے اور وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر دن رات محنت کرتے۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب اسے اور اس کے بابا کو اپنی محنت کا پھل ملا۔ اس نے آٹھویں کے امتحان میں پورے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کی ماں نے فرطِ مسرت سے اسے گلے لگا لیا اور کہا "بیٹا، میں چاہتی ہوں کہ تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ، بہت بڑے۔ پوری قوم تم پر فخر کرے، دنیا میں تمھارا نام روشن ہو بیٹا، یہی میری آرزو ہے۔ اس کو ضرور تکمیل تک پہنچانا۔" اس نے پُر اعتماد لہجے میں ماں کو یقین دلایا کہ اماں تمھاری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ اللہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔"

لیکن شاید قسمت کو ابھی اُس سے اور بھی امتحان لینا مقصود تھا۔ اس کے بابا سخت محنت اور مزدوری کی وجہ سے بیمار پڑ گئے اور صرف پندرہ دن کی علالت کے بعد جمیل، اس کی ماں اور بہنوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے۔ گھر میں کچھ ہوتا تو شاید بابا علاج معالجے سے صحت یاب ہو جاتے اور پھر رشتے داروں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ آڑے وقت میں کون کس کے کام آتا ہے۔ یہاں تو ہر شخص خود غرض تھا۔ بہرحال جمیل نے اسے بھی قسمت کی ستم ظریفی سمجھا اور صبر و تحمل سے کام لیا، کیوں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کو اپنی تعلیم بھی چھوڑنی پڑی، کیوں کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا تو تعلیم کہاں سے حاصل کرتا۔ خیر بابا کا چالیسواں گزرا تو اس نے کچھ مزدوری وغیرہ کرنے کے بارے میں سوچا تاکہ اپنی والدہ اور بہنوں کا پیٹ پال سکے۔ اس کے پڑوس ہی میں انور چاچا رہتے تھے۔ وہ اخبار ڈیلر تھے۔ انھوں نے اس کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا، چناں چہ وہ اب گھر گھر جا کر اخبارات تقسیم کرتا، لیکن اس کام سے ملنے والی رقم اس قدر کم تھی کہ وہ دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتے تھے، چناں چہ اس نے اخبارات تقسیم کرنے کے

علاوہ ایک ہوٹل پر برتن صاف کرنے بھی شروع کر دیے۔ اس طرح ان کی گزر اوقات اچھی ہونے لگی۔ وہ اپنا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے کرتا۔ اس لیے اس کے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ تعلیم کی لگن اس کے دل میں اب بھی موجود تھی، لیکن حالات کی مجبوریوں نے اسے بے بس کر دیا تھا، چناں چہ اب آہستہ آہستہ وہ اس بات کو بھولتا جا تا تھا کہ وہ ایک بڑا آدمی بنے گا اور اپنی قوم اور وطن کا نام روشن کرے گا، لیکن چاچا انور اس سے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ بیٹا! مایوسی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کا موقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، لیکن جمیل ہمیشہ انور چاچا کی باتوں کو محض ان کی عادت سمجھ کر فراموش کر دیتا۔

ایک دن جب وہ چاچا کی دُکان پر پہنچا تو چاچا نے کہا، "بیٹا جمیل، تمھارا محلّہ بدل گیا ہے۔" وہ کہنے لگا، "چاچا میں سمجھا نہیں۔" چاچا نے کہا، "بیٹا، آج سے تم اسکول والے محلّے میں اخبارات تقسیم کیا کرو گے۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔" اس نے جواب دیا اور اخبارات لے کر روانہ ہو گیا اور جب وہ اسکول کے دروازے پر پہنچا تو اس کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا لائبریری کی طرف بڑھا، جہاں اسے اخبار پہنچانا تھا۔ وہ لائبریری میں پہنچا تو وہاں اس کے پُرانے ماسٹر صاحب بیٹھے کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ اس نے سلام عرض کیا تو ماسٹر صاحب نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، "جمیل، تم کیا اخبار بیچتے ہو؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔ تب اس نے تمام واقعات ماسٹر صاحب کو بتائے۔ ماسٹر صاحب نے لائبریری کی دیوار پر لگے ہوئے طغرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اسے پڑھو جمیل۔" اس نے نظر اُٹھائی تو لکھا تھا:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

ماسٹر صاحب نے کہا، "دیکھو جمیل، لکیں شاعر کا مُدّعا تم ضرور سمجھ گئے ہو گے۔ بیٹا! دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ ہمّت اور محنت سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور جہاں تک تمھارے احساسِ کم تری کا تعلق ہے تو بیٹا امریکا کے بہت مشہور صدر گزرے ہیں ابراہام لنکن۔ وہ ایک کسان کے بیٹے تھے اور بہ ذاتِ خود ایک معمولی مزدور، لیکن ہمّت اور جرات نے انھیں امریکا کا صدر بنا دیا۔ اسی طرح مشہور عالمی سائنس داں ایڈیسن بھی ریل گاڑی میں اخبارات بیچتے تھے۔ ایک اور امریکی صدر ہنری ٹرومین بھی اخبارات بیچا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کولمبس اور کیپٹن کک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ تم بھی ہمت رکھو۔

اللہ ضرور پھل دے گا۔ تم میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کر دو اور رات کے وقت پڑھا کرو۔ انگریزی اور ریاضی کے سلسلے میں میں تمھاری مدد کروں گا۔

ماسٹر صاحب کی باتیں سُن کر اس کے دل میں حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے منزل نظر آنے لگی اور تمام خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے دکھائی دیے، چناں چہ دوسرے ہی دن اُس نے پوری لگن اور محنت کے ساتھ میٹرک کے امتحانات کی تیاری شروع کر دی۔ وہ دن کو اخبار بیچتا تھا اور رات کو پڑھتا تھا۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اللہ نے اس کو بھی اس کی محنت کا پھل دیا اور اس نے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اب کالج کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس نے ہوٹل میں کام بند کر دیا اور محلّے کے چند لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا۔ اس طرح گھریلو اخراجات آسانی سے پورے ہونے لگے۔ جہاں تک تعلیمی اخراجات کا تعلق تھا تو نادار طالب علم ہونے کی وجہ سے اس کی فیس معاف کر دی گئی اور اسے کالج کی جانب سے سیکنڈ ہینڈ کتابیں بھی مل گئیں۔ یہاں بھی اس نے محنت کو اپنا شعار بنایا اور ایف۔ اے میں بھی شان دار نتیجہ دکھایا۔ تھرڈ ایئر میں بھی کام یابی نے اس کے بڑھ کے قدم چومے۔ اب تعلیمی زندگی کا ایک اہم مرحلہ اس کے سامنے تھا۔ اب وہ بی۔اے کے فائنل ایئر میں تھا، چوں کہ امتحان میں صرف دو ماہ باقی تھے اس لیے اس کی تمام تر توجہ پڑھائی کی جانب مبذول تھی، اگر کوئی پیریڈ خالی نظر آتا تو اسے ماضی کی تلخ یادیں ناگن کی طرح ڈسنے لگتیں، جیسا کہ آج اس کے ساتھ ہوا۔ وہ انھی تصورات میں گم تھا کہ الیکٹرک بیل کی زور دار آواز نے اس کے خیالات کے سلسلے کو منقطع کر دیا۔ یہ اس کے آخری پیریڈ کی گھنٹی تھی۔ آخری پیریڈ کے بعد وہ لوٹا اور پھر دو ماہ کا عرصہ بھی پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ امتحان ہوئے اور نتیجہ اس کی توقع کے مطابق بے حد شان دار رہا۔ وہ آج بہت خوش تھا اس لیے کہ اس کی تعلیمی زندگی کا ایک اہم مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

اس کے بعد جمیل نے اپنی تعلیمی زندگی کا آخری امتحان، یعنی ایم۔اے بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اسی سال مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر جمیل نے اس امتحان میں بھی اعلا پوزیشن حاصل کی اور اسے ایک اعلا سرکاری عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ وہ دن اس کی زندگی کا ناقابلِ فراموش دن تھا۔ آج اسے اپنی محنت، ہمّت اور کوشش کا پھل مل گیا تھا۔ اس کی برادری کا ہر فرد آج جمیل کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ وہی برادری والے جنھوں نے کبھی اس سے آنکھیں پھیری

تھیں، لیکن جمیل کے سینے میں شمع علم فروزاں تھی۔ اسے علم نے ظلم نہیں بلکہ درگزر کرنا سکھایا تھا۔ اس نے تمام برادری والوں کو گلے لگایا۔ پھر وہ اپنی اماں سے لپٹ گیا۔ فرطِ مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنی ماں، اپنی جنّت کے سینے سے لپٹ کر کہہ رہا تھا:

"اماں، میں نے آپ کی آرزو کی تکمیل کر دی ہے۔ میں بڑا آدمی بن گیا ہوں اماں!"

مرجا گالب

کراچی کلب میں بیٹھے تھے۔ ہمارے دوست کا ملنے والا ایک سیٹھ ادھر آ نکلا۔ ہمارے دوست سیٹھ سے تپاک سے ملے اور کہنے لگے، "سیٹھ صاحب آیئے آپ کی ملاقات پاکستان، ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر سے کرائیں۔"

سیٹھ صاحب نے ہم سے مصافحہ کیا اور بولے:

"ہاں بھئی ہم جانتا ہے، یہ مرجا گالب ہے۔" (فیض احمد فیض)

سارے بچّوں کی پہلی پسند!

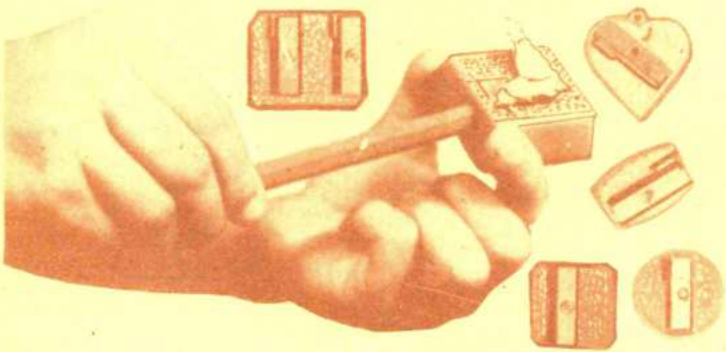

گارنٹی کے ساتھ پینسل کی نوک نہیں ٹوٹتے

انڈس شارپنر

مگر فساد خون سے بچنے کے لئے صافی بہتر ہے

خون میں سرایت کئے ہوئے فاسد مادے پھوڑے پھنسیوں اور کئی دوسری جِلدی بیماریوں کو جنم دیتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے صافی باقاعدگی کے ساتھ استعمال کیجئے۔ خُون کی صفائی اور جِلدی بیماریوں سے محفوظ رہنے کا مفید ذریعہ ہے۔

جڑی بوٹیوں
سے تیار شدہ

صافی

ہمدرد

سے خون بھی صاف، جلد بھی صاف

حمد

مرسلہ: فیبیہ فرید سلطان فرید، کراچی

آغاز تیرے نام سے کرتا ہوں خدایا
آغاز کا انجام کا مالک تجھے پایا

تو قادرِ مطلق ہے تری ذات بڑی ہے
تو سب سے بڑا ہے تری ہر بات بڑی ہے

دانائی و حکمت پہ تیری جب بھی کیا غور
راحت ترے ہر کام میں پائی ہے بہر طور

لبریز تشکر سے ہے دل آنکھ بھی نم ہے
جتنا بھی ترا شکر بجا لاؤں وہ کم ہے

قربان تری شانِ کریمی پہ خدایا
تُو نے مری امید کا ہر پھول کھلایا

(شباب کیرانوی)

نعت

مرسلہ: جہانگیر سکندر، شیر شاہ کالونی

ہم دل سے ہیں تم پر فدا حضرت محمد مصطفیٰ
تم نے خدا کے حکم سے

ڈنکا بجایا دین کا
پھیلا کے نورِ اسلام کا

جگ میں اُجالا کر دیا
ایمان کا انصاف کا

پیغام دنیا کو دیا
آکر بتایا آپؐ نے

کیا ہے بھلا کیا ہے بُرا
اُمّت تری بڑھتی رہے

صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

مجاہدوں کا لہو

عظمیٰ مختار، فیصل آباد

راحیل اپنی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ اس کا اور اس کی ماں کا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں سلائی کر کے گھر کا خرچ پورا کر رہی تھیں۔ انھوں نے دن رات محنت کر کے راحیل کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ لگاتار محنت نے ان کو بیمار کر دیا، لیکن وہ ایک پُرعزم خاتون تھیں۔ وہ راحیل کو فوجی افسر بنانا چاہتی تھیں۔ راحیل بلا کا ذہین تھا۔ اپنی کلاس میں ہر سال اوّل آتا۔ اس کا ذہن ہمیشہ سوچتا رہتا تھا۔ اس کے دل میں فوجی افسر بننے کی دُھن شدت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے والد میجر منصور بھی فوج میں تھے۔ راحیل کے دو بڑے بھائی شرجیل اور عقیل بھی تھے۔ ان میں بھی جذبۂ حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بھی شرجیل اور عقیل زیرِ تعلیم ہی تھے کہ سرزمینِ پاک کی سرحدوں پر دشمن نے حملہ کر دیا اور میجر منصور کا بلاوا آ گیا اور وہ وطن کی حفاظت کے لیے سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکلے۔ اب بیگم منصور بہت پریشان رہنے لگیں۔ وہ ہر وقت اپنے شوہر کی سلامتی اور اپنے ہم وطن فوجیوں کے لیے دعائیں مانگتیں، مگر شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس صبح بیگم منصور بڑی بے کل سی تھیں جنگ زوروں پر تھی۔ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی گئیں۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ فوج کا پیغام رساں سپاہی ان کے نام خط لیے کھڑا ہے۔ انھوں نے فوراً لفافہ چاک کیا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے شوہر میجر منصور بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ ان کی قیادت میں ان کے دستے نے ایک خفیہ مورچے کو تباہ کر دیا، لیکن وہ خود دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن گئے اور انھوں نے جامِ شہادت نوش کر لیا۔ بیگم منصور خط پڑھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں، لیکن بہت جلد ہوش میں آ گئیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ان کی آنکھ میں ایک آنسو نہ تھا۔ پھر وہ اپنے شوہر کی مغفرت کے لیے سربسجود ہو گئیں۔ راحیل اس وقت بارہ برس کا تھا۔ شرجیل اور عقیل پہلے ہی جذبہ حب وطن سے سرشار تھے۔ انھوں نے فوج میں خدمات انجام دینے کے لیے اپنی والدہ سے اجازت مانگی جو بیگم منصور نے بہ خوشی دے دی۔ ایک بار پھر بیگم منصور کے دل میں ہل چل مچ گئی۔ ان کا دل اپنے نوجوان بیٹوں کی سلامتی کے لیے بے چین تھا۔ پھر انھیں ایک دن اطلاع ملی کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ہماری فوج فاتح ہو کر لوٹی ہے۔ خوشی کے مارے ان کا دل بلیّوں اُچھل رہا تھا، مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ انھیں دوسری اطلاع یہ ملی کہ ان کے دونوں بیٹے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے جنگ میں کام آئے اور عقیل اور شرجیل کو ان کی بہادری پر نشانِ حیدر سے نوازا

گیا ہے۔ بیگم منصور ایک بار پھر سجدے میں گر گئیں اور اللہ سے اپنے بچّوں کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگیں۔

راحیل کی والدہ بیگم منصور نے اپنا بنگلہ بیچ کر راحیل کی اعلا تعلیم کے لیے رقم محفوظ کر لی۔ اب وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں۔ پھر جب راحیل میٹرک کر چکا تو اس نے بھی اپنی امّی سے فوج میں شامل ہونے کی اجازت مانگی۔ راحیل کی والدہ نے اسے بہ خوشی اجازت دے دی۔ اب راحیل پاک فوج میں ایک بڑا افسر ہے اور وطن کی حفاظت کے لیے ہر لمحہ تیار اور مصروف ہے۔ اسے اس بات پر فخر ہے کہ اس کے والد بیگم منصور ایک بہادر سپاہی تھے، جنھوں نے وطن کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ اسے اس بات پر بھی فخر تھا کہ اس کے دو جوان بھائیوں نے وطن کے تحفّظ کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر دی تھیں اور وہ بھی اپنی جان نثار کرنے کے لیے تیار تھا۔ بیگم منصور کو بھی اپنے بہادر شوہر اور دلاور بچّوں پر ناز تھا اور وہ فخر سے کہا کرتی تھیں کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ اپنے تیسرے بیٹے کو بھی وطن کی آن کے لیے مر مٹنے کا حکم دیں گی۔

فرض

بابر سلیم، گجرات

جاوید ریاض کا چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں یتیم تھے۔ ریاض نے محنت مزدوری کر کے اپنے والدین کے خواب کو پورا کیا۔ ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد حکومت نے جاوید کو ایک گاؤں ہنجوڈار میں متعیّن کیا چناں چہ جاوید کو گاؤں میں ہی رہنا پڑا۔ ریاض بھی اس کے ساتھ ہسپتال سے ملحقہ ایک کوٹھی نما مکان میں دونوں بھائی سو رہے تھے۔ تقریباً فجر کی نماز سے آدھا گھنٹہ قبل کسی نے ان کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ریاض نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ ایک نوعمر لڑکا پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی لڑکے نے ریاض کو لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا، "ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟" اتنے میں جاوید کی آنکھ کھل چکی تھی۔ وہ دروازے کے پاس آیا۔ جاوید پر نظر پڑتے ہی لڑکے نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، "ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ چلیں میرے والد کی حالت بہت خراب ہے۔" ریاض اندر جا کر جاوید کی دواؤں کا بیگ اُٹھا لیا اور وہ دونوں لڑکے کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیے۔ ان کے قدم بہت تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ جاوید اور ریاض کی نظر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جب مریض کے چہرے پر پڑی تو دونوں کے قدم جہاں تھے وہاں رُک گئے۔ جو شخص بیماری کے عالم میں ان کے سامنے پڑا ہوا تھا ان کے باپ کا قاتل تھا۔ بے بسی کے عالم میں لیٹا ہوا شخص جاوید اور ریاض کے گاؤں چنوں والا کے چودھری کا بیٹا حامد تھا۔ حامد کا کسی بات پر جاوید کے باپ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ جاوید کا باپ حق پر تھا مگر حامد اس وقت اپنی طاقت کے بل پر اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ جاوید کے باپ نے اس کی بات ماننے سے

انکار کر دیا تھا۔ حامد نے اس انکار کو اپنی توہین سمجھا اور غصّے میں آکر جاوید کے باپ کا خون کر دیا۔ قتل کرنے کے بعد یہ اس گاؤں سے فرار ہو کر بنجوڑار آ گیا اور یہاں آکر اس نے شادی کر لی۔ جاوید کو بُلا کر لانے والا اس کا بیٹا مقصود تھا۔ باپ کے قتل ہونے کے وقت جاوید دس بارہ برس کا اور ریاض سترہ اٹھارہ برس کا تھا۔ ریاض جاوید کو لے کر شہر آ گیا اور محنت مزدوری کر کے جاوید کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

ریاض نے جاوید کا بازو پکڑ کر اسے آہستہ سے کہا، "یہ وہی ہے آؤ ہم واپس چلیں۔ ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ اسے مرنے دو۔ اسے تڑپنے دو۔ اس نے ہمیں تڑپایا تھا۔ چلو چلیں یہاں سے۔" جاوید بڑی کش مکش میں پڑ گیا۔ ایک طرف نفرت اور بڑے بھائی کا حکم تھا اور دوسری طرف فرض۔ جاوید کے دل و دماغ کے درمیان بڑی زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ دل کہتا تھا کہ یہ ظالم ہے۔ اسے اپنے گناہوں کی سزا ملنی چاہیے۔ دماغ کہتا، جاوید تم ڈاکٹر ہو۔ اس وقت تمہارے درمیان مریض اور ڈاکٹر کا رشتہ ہے۔ یہ اس وقت تمہارا دشمن نہیں، تمہارا مریض ہے اور ہر مریض کا علاج کرنا تمہارا فرض ہے۔ دل کہتا ہے کہ اس نے تم پر رحم نہیں کیا تھا، اس لیے یہ تمہارے رحم کا بھی کسی طرح مستحق نہیں۔ اچانک جاوید نے آگے بڑھ کر حامد کا معائنہ کیا اور بیگ میں سے ٹیکا نکال کر لگایا۔ ریاض یہاں سے جا چکا تھا۔ جاوید مطمئن تھا، کیوں کہ وہ اپنا فرض ایمان داری سے نباہ رہا تھا۔ جاوید نے اپنے بیگ سے وہ کپڑا نکال کر منھ پر باندھ لیا جو ڈاکٹر آپریشن کے وقت منھ پر باندھتے ہیں تاکہ جب حامد کو ہوش آئے تو وہ جاوید کو دیکھ کر پریشان نہ ہو۔

تم عرفان ہو؟

محمد عمر احمد خان، لانڈھی

صبح سات بجے بچّے اسکول جاتے تھے اور صبح سات بجے چھوٹو گیراج کھولتا تھا۔ گیراج کے بالکل سامنے اسکول تھا جہاں بے شمار بچّے پڑھنے آتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ننھے ننھے پیارے پیارے سرخ و سپید بچّے جب اپنے کاندھوں پر بستہ لٹکائے اسکول آتے تو چھوٹو ٹکٹکی باندھے انھیں حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہتا۔

ننھے منّے معصوم پھول جیسے بچّوں کو دیکھ کر بے اختیار اسے اپنا بچپن یاد آجاتا جب وہ بھی اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ اس کا نام اس وقت عرفان تھا چھوٹو نہیں۔ چھوٹو تو وہ بہت بعد میں بنا۔ اپنے بچپن میں وہ بھی اسکول جاتا تھا۔ اس کی ماں کی بڑی خواہش تھی کہ پڑھ لکھ کر وہ بڑا آدمی بنے۔ اسے ماں کی خواہش کا علم تھا، لیکن اسے پڑھائی میں بالکل مزہ نہ آتا تھا۔ اسکول کے بچّے تتلیاں اور جگنو پکڑتے

کے بجائے علم کی دولت حاصل کرتے تھے، لیکن عرفان سارا وقت کھیل کود اور تتلیاں پکڑنے میں صرف کر دیتا۔ وہ یہ سوچ کر پڑھائی میں دل چسپی نہ لیتا کہ ابھی بہت وقت باقی ہے، اسے جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے کبھی کوئی کام وقت پر نہ کیا تھا۔ اسے آج کا کام کل پر چھوڑنے کی عادت تھی۔ بچپن میں کبھی اس نے وقت کی قدر نہیں کی۔ جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا تب بھی وہ کبھی وقت پر اسکول نہیں گیا۔ نہ اُسے وقت پر کام کرنے کی عادت تھی۔ ٹیچر اسے گھر کا کام دیتی وہ گھر آکر کھانا کھاتا اور پھر کھیل کُود میں لگ جاتا۔ سوچتا کہ ابھی کافی وقت پڑا ہے کام مکمل کرنے کے لیے۔ وقت آہستہ آہستہ گزر جاتا یہاں تک کہ رات ہو جاتی اور وہ بغیر ہوم ورک کیے گہری نیند سو جاتا۔

صبح اسے دیر سے اُٹھنے کی عادت تھی۔ دیر سے ہی وہ منھ ہاتھ دھونا، دیر سے ہی ناشتہ کرتا، دیر سے کپڑے بدلتا اور دیر سے ہی وہ اسکول پڑھنے جاتا۔ اسکول میں اسے ہر وقت ڈانٹ پڑتی رہتی، لیکن اس کی ماں نے کبھی اسے نہ ڈانٹا تھا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں اس سے بے حد پیار کرتی تھی۔ اس کی معمولی تکلیف سے تڑپ اٹھتی، اس کے آرام کا خیال رکھتی اور کبھی اسے اس کے غلط کام پر نہ ڈانٹتی۔ ماں کی ڈھیل نے اسے کھلی چھٹی دے دی۔ وہ اسکول سے بھاگنے لگا۔ کئی کئی دن اسکول نہ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نام اسکول سے کٹ گیا۔ عرفان نے سوچا، "چلو اچھا ہی ہوا اسکول سے جان چھوٹی۔"

اسے اسکول چھوڑنے کا کوئی دکھ نہ تھا، لیکن اس کی ماں کو اس بات کا شدید دکھ ہوا تھا۔ اس کی ماں اسے دوبارہ اسکول میں داخل کرانا چاہتی تھی، لیکن اسے اب پڑھنے لکھنے سے کوئی دل چسپی نہ رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ اب پڑھنا نہیں چاہتا۔

اس کے منھ سے یہ بات سُن کر ماں چپ ہو گئی۔ ماں نے اندازہ کر لیا تھا کہ عرفان اس کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ چکا ہے۔ اب وہ نہیں پڑھے گا۔ ماں کو اپنے خواب کے ٹوٹنے کا بے حد افسوس تھا۔ وہ عرفان کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی تھی، لیکن عرفان بڑا آدمی بننا نہیں چاہتا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ عرفان ایک گیرج میں گاڑیوں کو ٹھیک کرنے کا کام سیکھنے لگا۔ میلے کچیلے تیل اور پیٹرول میں چیکٹ کپڑوں میں وہ گاڑیوں کو ٹھیک کرتا رہتا۔ اس کے ساتھ چند دوسرے لڑکے بھی گیرج میں کام کرتے تھے۔ سب لڑکے بڑے تھے۔ وہ ان سب سے چھوٹا تھا۔ شروع میں استاد اُسے چھوٹو کہہ کر بُلاتا تھا۔ بعد میں سب اسے چھوٹو کہنے لگے۔ کوئی اسے اس کے نام سے نہ پکارتا تھا۔ سب اس کا اصل نام بھول گئے تھے۔ جو نام سب کو یاد رہ گیا تھا وہ "چھوٹو" تھا۔ وقت کا پہیا جوں جوں گھومتا جا رہا تھا اس سے اس کی کئی قیمتی چیزیں چھنتا جا رہا تھا۔ پہلے اس کی زندگی کے ابتدائی قیمتی سال وقت نے چھین لیے، پھر اس کی سب سے قیمتی چیز ماں کو بھی

وقت نے اس سے چھین لیا۔ ماں ایک دن اسے روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے دل میں اسے بڑا آدمی بنانے کی حسرت لیے منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ ماں کے مرنے کے بعد اسے وقت کی اہمیت کا احساس ہوا، لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ گزرے ہوئے وقت کو یاد تو کر سکتا تھا، لیکن گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اب وہ گبھرو نوجوان بن چکا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ بازو کی تڑپتی ہوئی مچھلیاں اور باہر نکلا ہوا سینہ اسے فولادی قسم کا نوجوان ظاہر کرتا۔ بہ ظاہر اداس سے وہ پُرسکون نظر آتا، لیکن اندر سے اس کی روح کتنی بے چین تھی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

چند برسوں میں بہت ساری تبدیلیاں آئی تھیں۔ جس گیرج میں وہ کام کرتا تھا اس کا مالک باہر چلا گیا تھا۔ گیرج بند ہو گیا تھا۔ چھوٹو نے ایک دوسرے گیرج میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس گیرج میں آ کر اسے بہت سکون ملا تھا، کیوں کہ گیرج کے بالکل سامنے اسکول تھا جہاں ننھے ننھے سرخ و سپید پھول جیسے معصوم بچے علم حاصل کرنے آتے تھے۔ چھوٹو ٹکٹکی باندھے بچوں کو نکتا رہتا۔ اسے اسکول جاتے اور علم حاصل کرتے ہوئے بچے بے حد اچھے لگتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو یوں محسوس کرتا جیسے وہ بچہ بن گیا ہو اور اسکول پڑھنے جا رہا ہو۔

چھوٹے چھوٹے ننھے منے معصوم پھول جیسے بچوں کو دیکھ کر اسے بے اختیار اپنا بچپن یاد آ جاتا۔ اپنے بچپن میں وہ بھی تو اسکول جاتا تھا۔ جہاں بچے تتلیاں اور جگنو پکڑنے کے بجائے علم کی دولت حاصل کرتے تھے۔ گو اسے پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا لیکن اسکول میں گزرے ہوئے یادگار لمحے اسے اکثر یاد آتے۔ چھوٹو آنکھیں بند کر لیتا تو یادوں کی دھنک اس کی میلی آنکھوں میں اُتر آتی۔ اس کے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر جاتے۔ یادوں کے سنہری اور انمول رنگ جو تتلیوں کے رنگوں سے کہیں زیادہ خوب صورت تھے، جو اس کی اندھیری زندگی میں جگنوؤں کی مانند جھل مل جھل مل چمکتے رہتے تھے۔ اسے اکثر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ماضی کے باغیچے میں پہنچ کر یادوں کی رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑ رہا ہو۔ جب وہ یادوں میں کھویا ہوتا تو بے اختیار اسے اپنی ماں کی یاد بھی آتی، جو اسے ہمیشہ بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ ماں کی خواہش کو یاد کر کے اس کے دل پر جیسے گھونسا سا لگتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے جنھیں وہ چپ چاپ بڑی خاموشی سے پی لیتا۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ اس نے وقت کی قدر نہیں کی اور نہ ماں کی خواہش کو پورا کر سکا۔

چھوٹو ایک دن گیرج میں کام کر رہا تھا کہ سرخ رنگ کی ایک شان دار کار گیرج کے باہر آ کر رُکی۔ اس میں سے ایک خوب صورت لمبا چوڑا نوجوان باہر نکلا۔ نوجوان نے چھوٹو سے کہا، "ذرا اس گاڑی کا انجن چیک

کرنا۔ یہ آواز دے رہا ہے۔" چھوٹو نے کار کا بونٹ اُٹھایا اور انجن چیک کرنے لگا۔ نوجوان بڑے غور سے چھوٹو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چھوٹو نے نوجوان کی نگاہوں کی تپش محسوس کی تو اس نے بھی اپنا سر اُٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے کہیں دیکھ چکا ہو۔

نوجوان نے چھوٹو کی طرف انگلی اُٹھائی اور جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا، "اگر میں غلطی پر نہیں تو یقیناً تم عرفان ہو!"

بہت دنوں کے بعد کسی کے منھ سے اپنا اصل نام سُن کر چھوٹو کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ نوجوان نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر وہ بولا، "میں شاہد ہوں، یاد ہے جب ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے تو تم پڑھنے لکھنے کے بجائے ہر وقت کھیلتے کُودتے رہتے تھے۔ مس تمھیں ہر وقت وقت کی اہمیت کا احساس دلاتی تھیں، لیکن تم مس کی باتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے تھے۔ تمھیں وقت کی قدر کی اہمیت کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا۔ پھر تم نے اسکول چھوڑ دیا۔ سُنا ہے کہ تمھاری ماں تمھیں پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی تھیں۔"

اتنا کہہ کر نوجوان نے چھوٹو کے دونوں کاندھوں پر اپنا ہاتھ رکھا پھر اس نے چھوٹو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"عرفان یہ وقت بڑی ظالم چیز ہے جو اس کی قدر نہیں کرتا یہ اُس کی قدر نہیں کرتا۔ وقت کا کام گزر جانا ہے یہ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ جو اس کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چلتا، وقت پر کام نہیں کرتا وہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ پھر وہ کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا ہے۔"

تتلی

مرسلہ: عبد القیوم، قاضی احمد

جانی پہچانی ہے تتلی
پھولوں کی رانی ہے تتلی

پیاری پیاری نازک سی ہے
یا پریوں کی شہزادی ہے

اس کے ہیں انداز نرالے
خوش ہیں اس کو دیکھنے والے

پھولوں پر یہ ناچ رہی ہے
پھولوں کی یہ متوالی ہے

اس کے پروں میں رنگ بھرے ہیں
دیکھ کے ہم حیران کھڑے ہیں

نیلا ہو یا ہو مٹیالا
کوئی نہیں ہے مٹنے والا

شہد بیچنے والا

صالحہ مسعود برکاتی، کراچی

ایک آدمی گھوم پھر کر شہد بیچا کرتا تھا۔ وہ

بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا۔ ہر خریدار کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے پاس خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کے میٹھے بول کا یہ اثر تھا کہ اگر وہ شہد کی جگہ زہر بھی دے دیتا تو لوگ اسے شہد سمجھتے۔ اس کی یہ مقبولیت دیکھ کر ایک تنگ نظر اس سے جلنے لگا اور اس نے بھی شہد بیچنے کا ارادہ کر لیا، چناں چہ سر پر شہد کا مٹکا لے کر شہد بیچنے نکلا، مگر چوں کہ وہ بدمزاج تھا اور بات بات پر غصہ ہونا اس کی فطرت تھی اس لیے ایک خریدار بھی اس کے پاس نہ آیا۔ وہ رات کو بہت ہی مایوس گھر واپس آیا۔ جب اس کی بیوی نے اس کی مایوسی دیکھی تو ہنستے ہوئے کہا:

"جو بدمزاج ہوتا ہے اُس کا شہد بھی کڑوا ہوتا ہے، اس لیے تمھارے پاس کوئی خریدار نہیں آیا۔"

(بوستانِ سعدیؒ)

ایک سچّا واقعہ

شہزاد احمد خاں، کراچی

میرے دوست رحمان کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ کسی بھی انسان کے لیے باعثِ عبرت ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ چار پانچ سال قبل حیدر آباد اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر پیش آیا۔ رحمان کی بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی، چناں چہ دونوں اپنی والدہ کے ساتھ تقریباً صبح دس بجے بازار جانے کے لیے گھر سے نکلے اور ایک رکشا کو روکا۔ رکشا والا چلنے پر راضی ہو گیا۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ ایک بہت بڑی آفت ان کا انتظار کر رہی ہے۔

ہوا یہ کہ جب رکشا ریلوے کراسنگ کے قریب پہنچا تو پھاٹک بند ہونے والا تھا، کیوں کہ ریل گاڑی آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ رکشا ڈرائیور نے چاہا کہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے ہی وہ ریلوے لائن پار کر ڈالے، لہٰذا اس نے رکشا کی رفتار تیز کر دی۔ رکشا تیزی سے ریلوے لائن پار کرنے لگا، مگر عین درمیان میں رکشا کی کوئی چیز لائن میں اٹک گئی۔ رکشا والے نے بے انتہا کوشش کی، مگر رکشا لائن میں پھنس کر رہ گیا۔ رکشا والے نے بہت زور لگایا، مگر رکشا ٹس سے مس نہ ہوا۔ ریل گاڑی قریب آتی گئی۔ رکشا کی سواریوں پر خوف طاری ہو گیا۔ گھبراہٹ میں کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ رکشا سے چھلانگ لگا دینی چاہیے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت عقل کام نہیں کرتی تو یہی بات اس وقت بھی ہوئی، مگر جب ریل گاڑی بالکل ان کے سروں پر آ پہنچی تو رحمان نے رکشا سے چھلانگ لگا دی۔ اُس کی دیکھا دیکھی اس کی والدہ نے بھی یہی کوشش کی، مگر افسوس ابھی وہ رکشا سے نکلی ہی تھیں کہ انجن نے رکشا کو ٹکر مار دی۔ وہاں جو لوگ یہ سب دیکھ رہے تھے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بہر حال جب یہ طوفان ختم ہوا تو ایک لرزہ خیز منظر سامنے تھا۔ رکشا کے پرخچے اُڑ گئے۔ رکشا ڈرائیور بُری طرح زخمی ہوا۔ رحمان کی بہن دلہن بننے سے پہلے ہی موت کی وادی میں جا سوئی۔ رحمان کی والدہ

کی حالت بھی نازک تھی اور رحمان بھی کافی زخمی ہوگیا تھا۔

ڈرائیور نے وہیں دم توڑ دیا۔ ماں بیٹوں کو ہسپتال لے جایا گیا۔ ماں نے ہوش میں آنے کے بعد جب بیٹی کے بارے میں پوچھا تو ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ دوسرے کمرے میں ہے۔ رحمان تو چند روز بعد ٹھیک ہوگیا، مگر اس کی والدہ کو تین چار ماہ بعد ہسپتال سے چھٹی ملی اور جب انھیں اپنی بیٹی کے مرنے کی خبر ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

محض ڈرائیور کی جلد بازی اور بے پروائی کی وجہ سے دو افراد موت کے منہ میں چلے گئے اور ایک اچھا بھلا خاندان ویران ہوگیا۔

وطن کی رونق

مرسلہ: صوفیہ نور بن محمد بلوچ، حیدرآباد

اے ننھے منّے تارو
تم میرے پاس آؤ
اپنی چمک سے مجھ کو
تم راستہ بتاؤ
جی چاہتا ہے میرا
میں تم کو توڑ لاؤں
تاروں کی روشنی سے
اپنا وطن سجاؤں
اپنے وطن کی رونق
تم سے بڑھاؤں گا میں
تم کو سجاؤں گا میں
تم کو سجاؤں گا میں

ایف سولہ لڑاکا طیارہ

مسعود احمد، ملیر کالونی

ایف سولہ جی ہاں یہی وہ لڑاکا طیارہ ہے، جو پاکستان کی فضائی برتری کا واضح نشان ہے۔ ایف سولہ (F-16) کا اصل نام فائٹنگ فالکن ہے یعنی لڑاکا باز۔ اس کی رفتار آواز سے دوگنی ہے۔ اس میں بہ یک وقت لڑاکا اور دفاعی دونوں قسم کے طیاروں کی خصوصیات موجود ہیں۔

ایف سولہ امریکی کمپنی "جنرل ڈائنامکس" کے پلانٹ میں تیار ہوتا ہے لیکن یہ مکمل طور پر اس کمپنی کا تیار کردہ نہیں ہے۔ اس وقت ارضِ خاکی کا کوئی بھی ترقی یافتہ ادارہ کوئی ایک چیز بھی مکمل طور پر نہیں بناتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا ادارہ ہر معاملے میں اعلا کارکردگی کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ایف سولہ طیارے کے بھی مختلف کل پُرزے اور حصّے اس وقت امریکا اور یورپ کی تقریباً ۳۰ طیارہ ساز کمپنیاں تیار کر رہی ہیں۔ ایف سولہ کو ۱۹۷۲ء میں جانچا گیا۔ اس کی خامیاں دُور کرنے کے لیے اسے مختلف مراحل سے گزارا گیا اور ۱۹۷۷ء میں اس کو موجودہ

شکل میں لایا گیا۔

ایک ایف سولہ طیارے کی قیمت تقریباً تین کروڑ اسی لاکھ ڈالر یا ۵۷ کروڑ رُپے ہوتی ہے۔ ایک طیارہ مکمل ہونے میں تقریباً ۱۸۰ ہفتے لگ جاتے ہیں۔

ایف سولہ طیارے میں صرف ایک پائلٹ بیٹھ سکتا ہے۔ اس کا کاک پٹ ایئر کنڈیشنڈ ہوتا ہے جسے میک ڈونل ڈگلس کمپنی تیار کرتی ہے۔

طیارے میں "ویسٹنگ ہاؤس" کمپنی کا ریڈار لگایا گیا ہے، جس کی مدد سے ۳۷ سے ۵۶ کیلومیٹر تک زمینی فاصلہ اور فضا میں ۴۶ سے ۷۴ کیلومیٹر کی بلندی تک صورتِ حال دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس طیارے میں نشانے کا تعین کرنے کا آلہ، آگ پر قابو پانے والا کمپیوٹر، روشنی اور آواز کی مدد سے کام کرنے والا کیمرا، ریڈار الیکٹرو آپٹیکل ڈسپلے یونٹ بھی نصب ہیں۔ اس کے علاوہ طیارے میں جنرل الیکٹرک کی تیار کردہ ۲۰۔ ایم ایم کی ایک توپ نصب ہے، جس سے ایک وقت میں پانچ سو راؤنڈ فائر کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ پَروں کے دونوں سِروں پر زیریں سرخ شعاعوں سے کام کرنے والے، ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے دو میزائل بھی نصب ہیں۔ ضرورت پڑنے پر درمیانی دھڑ کے نچلے حصّے پر چھ میزائل لگائے جاسکتے ہیں۔ ایندھن کم ہونے کی صورت میں اس پر کل پندرہ ہزار دو سو پونڈ وزن تک کے ہتھیار (بم اور میزائل) لے جانے کی گنجائش ہوتی ہے البتہ ایندھن کی ٹنکی پوری بھری ہونے کی صورت میں یہ وزن زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار پونڈ تک ہوسکتا ہے۔

اس طیارے میں پہلی بار ۶۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اسپیرو میزائل اور پھر نومبر ۱۹۷۸ء میں اسکائی فلیش میزائل چھوڑنے کے تجربات کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم میں جوش و جذبہ ہمّت، شجاعت اور حوصلہ قائم رہے۔ تاکہ جب بھی کسی اسلام دشمن کی نظریں ہماری طرف بری نیت سے اُٹھیں ہم انھیں تہ تیغ کر ڈالیں۔ پاکستان زندہ باد۔

سخاوت اور حسد

نیلوفر تبسم، اسلام آباد

حاتم کے ہی زمانے کا قصّہ ہے۔ یمن میں ایک بادشاہ تھا، جو بڑا نیک اور سخی تھا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی جی کھول کر مدد کرتا، لیکن جہاں سخاوت کا ذکر آتا، سب لوگ حاتم کے ہی گُن گاتے۔ یمن کا بادشاہ یہ سُن کر بہت کُڑھتا۔ وہ دل ہی دل میں حاتم سے نفرت کرنے لگا۔ بادشاہ نے سوچا جب تک حاتم زندہ رہے گا لوگ میرے احسان اور انعام کو ہرگز یاد نہ رکھیں گے۔ حاتم کو قتل کرا دینا چاہیے۔ تب اُس نے ایک نڈر آدمی کو رُپیوں کا لالچ دے کر اس کام کے لیے تیار کیا۔

لالچی آدمی منزلیں مارتا حاتم کے علاقے میں جا

پہنچا۔ اتفاق کی بات، حاتم راستے میں ہی مل گیا۔ حاتم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑے تپاک سے اُسے اپنے گھر لے گیا۔ پہلے کھانا کھلایا، پھر پاؤں دبائے۔ غرض وہ رات اُس آدمی نے بڑے آرام سے گزاری۔

جب صبح ہوئی تو جانے کے لیے تیار ہوا۔ حاتم نے منّت کے ساتھ اس سے چند دن اور رہنے پر اصرار کیا، لیکن مہمان نے کہا: "میں ایک بڑے ضروری کام کے لیے جا رہا ہوں۔ میرے لیے یہی اچھا ہے کہ جس قدر جلدی ہو سکے یہاں سے چلا جاؤں۔"

حاتم کچھ حیران ہوا اور بولا، "بھلا ایسا بھی کیا کام ہے۔ مجھے حکم دو شاید میں تمھارے کسی کام آ سکوں۔"

مہمان نے حاتم سے سب حال کہہ سنایا اور قسم لے لی کہ "دیکھو خبردار! کسی سے کہنا مت"۔ حاتم نے یہ سُنا تو مہمان کو ساتھ لیا۔ اُسے تنہا کمرے میں لے گیا۔ خود تو فرش پر لیٹا اور تلوار مہمان کے ہاتھ میں دے کر کہا، "آپ شوق سے تلوار چلائیے۔ حاتم میرا ہی نام ہے۔" مہمان یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ حاتم کے قدموں پر گر پڑا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو۔ یہ بد ارادہ تم ایسے فرشتہ صفت آدمی کے حق میں میرے لالچی دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب میں تم کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

آخر وہ نڈر آدمی شاہِ یمن کے سامنے حاضر ہوا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ بادشاہ نے کہا "تم سچ کہتے ہو۔ حاتم جیسا سخی کوئی نہیں۔ وہ تو مجھ سے کہیں زیادہ تعریف کے قابل ہے۔" اس کے بعد اُس آدمی کو خلعت دے کر حاتم کی خدمت میں دوبارہ بھیجا اور جب تک زندہ رہا حاتم کی دوستی کا دَم بھرتا رہا۔

پروگرام

مرسلہ: فرخ نبیلہ گل، کراچی

صبح اُٹھوں اسکول کو جاؤں
خوب پڑھوں اور واپس آؤں
تھک کر جب میں چُور ہو جاؤں
رات کو پڑھ کر بس سو جاؤں
چاروں طرف اندھیارا چھائے
ٹھنڈی ہوا پنکھے کی آئے
سو کر اٹھوں باہر جاؤں
گھر والوں کا سودا لاؤں
شام کو جب میں کھیلنے جاؤں
مغرب تک پھر گھر میں نہ آؤں
پھر میں آ کر بستہ کھولوں
کام کروں گھر بھر سے نہ بولوں
باجی کو میں سبق سناؤں
پھر جی بھر کے کھانا کھاؤں

پانچ ہم شکل چینی بھائی

منیب ارسلان، ملتان

ایک دفعہ کا ذکر ہے چین میں پانچ بھائی رہتے تھے۔ جن کی شکلیں ایک دوسرے سے بالکل ملتی جلتی تھیں اور ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ سمندر کے کنارے رہتے تھے۔ ان میں ایک ایک خوبی تھی۔ سب سے بڑا بھائی پورا سمندر پی سکتا تھا۔ دوسرے کی گردن لوہے کی تھی۔ تیسرے کی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنی ٹانگیں بہت ہی لمبی کر سکتا تھا۔ چوتھے کی خوبی یہ تھی کہ اس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی اور پانچویں کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنا سانس بہت دیر تک روک سکتا تھا۔

ہر روز سب سے بڑا بھائی مچھلیاں پکڑتا تھا اور انھیں بازار میں فروخت کر دیتا تھا۔ ایک روز وہ جب بازار سے گزر رہا تھا تو اس سے ایک لڑکے نے پوچھا کہ کیا وہ بھی اس کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کے لیے جا سکتا ہے؟

بڑے بھائی نے کہا، "نہیں"۔ لڑکا اصرار کرتا رہا۔ بڑے بھائی نے ایک شرط کے تحت حامی بھر لی۔ بڑے بھائی نے کہا، "تمھیں میرا کہا ماننا پڑے گا"۔ بچے نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا کہا مانے گا۔ دوسرے روز جب بڑا بھائی مچھلیاں پکڑتے سمندر پر گیا تو وہ لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ بڑے بھائی نے کہا، "یاد رکھو، تمھیں میرا کہنا ماننا ہے۔ میں جب تمھیں واپس آنے کا اشارہ کروں تو تم واپس آ جانا"۔ لڑکے نے پھر وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

اس کے بعد بڑا بھائی سمندر پی گیا اور ساری مچھلیاں سمندر کی تہ میں رہ گئیں۔ یہ دیکھ کر لڑکا بہت خوش ہوا اور سمندر کی طرف بھاگا۔ اس نے سیپیاں اور مختلف قسم کے پتھر اپنی جیبوں میں بھر لیے اور کنارے پر بڑے بھائی نے مچھلیاں جمع کر لیں۔ سمندر کو وہ منھ میں رکھے رکھے جب تھک گیا تو اس نے لڑکے کو واپسی کے لیے اشارہ کیا، لیکن لڑکے نے کوئی توجہ نہیں دی اور جب بڑا بھائی بہت تھک گیا تو اس نے لڑکے کو بہت مشکل سے سمجھایا کہ وہ واپس آ جائے، لیکن اس کے جواب میں لڑکے نے اس کا منھ چڑایا۔ اس نے سوچا کہ میں نے اگر سمندر کو پیٹ میں رکھا تو میرا پیٹ پھٹ جائے گا اور اگر سارے سمندر کو اُگل دیا تو لڑکا سمندر میں ڈوب جائے گا۔ بڑا بھائی جب زیادہ دیر تک سمندر کو پیٹ کے اندر نہ رکھ سکا۔ تو اس نے سمندر کو اُگل دیا جس سے لڑکا سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔

جب بڑا بھائی سمندر سے واپس آیا اور لوگوں نے لڑکے کو اس کے ساتھ نہیں پایا تو اسے پکڑ لیا اور اسے منصف کے پاس لے گئے۔ منصف نے کہا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ بڑے بھائی نے ایک دن کی مہلت مانگی اور ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر

کی۔ منصف نے اس کی اجازت دے دی۔

وہ اپنے گھر چلا گیا اور اس نے اپنی ماں اور سارے بھائیوں کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ دوسرے دن اس کی جگہ لوہے کی گردن والا بھائی حاضر ہوا اور کوئی اسے پہچان نہ سکا۔ اس کا سر شہر کے چوک میں اُڑایا جانے والا تھا لہٰذا سارے لوگ چوک میں جمع ہو گئے تاکہ اس کا سر قلم ہوتا ہوا دیکھ سکیں، مگر جب جلاّد نے اس کے سر پر تلوار ماری تو اسے کچھ نہ ہوا، البتہ تلوار ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد جلاّد نے یکے بعد دیگرے تین دفعہ تلوار چلائی اور تینوں دفعہ تلواریں ٹوٹ گئیں اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

منصف نے اعلان کیا کہ اُسے سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ یہ سزا سُن کر دوسرے بھائی نے کہا کہ میں مرنے سے قبل اپنی ماں کو خدا حافظ کہنا چاہتا ہوں، چناں چہ منصف نے اس کی اجازت دے دی۔ دوسرا بھائی جب ماں سے ملنے گھر گیا تو اس نے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ دوسرے روز اس کی جگہ تیسرا بھائی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ اسے بھی کسی نے نہیں پہچانا۔ اسے کشتی میں بٹھا دیا گیا۔ وہ جب گہرے سمندر میں گئے تو انھوں نے اسے دھکّے مار کر سمندر میں پھینک دیا، لیکن اس نے اپنی ٹانگوں کو لمبا کر دیا اور بالآخر اس کی ٹانگوں نے سمندر کی تہ کو چھو لیا اور اس کا چہرہ پانی کے اوپر اُبھر آیا۔

اور وہ مسکرانے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو اور بھی غصّہ آیا اور وہ اسے پکڑ کر ساحل پر لے آئے۔

منصف نے فیصلہ کیا کہ اسے دہکتی آگ میں جھونک دیا جائے۔ اس نے منصف سے درخواست کی کہ وہ مرنے سے قبل اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہے۔ منصف نے اسے اس کی اجازت دے دی۔ اس بار اس کی جگہ چوتھا بھائی واپس آیا جس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی۔ شہر کے چوراہے پر بہت بڑا الاؤ جلایا گیا اور چوتھے بھائی کو اس میں ڈال دیا گیا، مگر چوتھا بھائی بڑے اطمینان سے آگ کے اندر کھڑا رہا، جس کی وجہ سے لوگوں کے غصّے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ منصف کے حکم سے اسے ایک ایسے کمرے میں بند کر دینے کا فیصلہ کیا گیا جہاں نہ ہوا ہو اور نہ روشنی۔ جہاں وہ دم گھٹ کر مر جائے۔ چوتھے بھائی نے منصف سے کہا کہ وہ مرنے سے قبل اپنی ماں کو سلام کرنا چاہتا ہے، اس لیے اسے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ منصف نے اسے اجازت دے دی۔ وہ گھر چلا گیا اور اس کی جگہ پانچواں بھائی واپس آیا۔ اسے بھی کوئی پہچان نہ سکا۔ پانچویں بھائی کو ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں ہوا کی گنجائش نہیں تھی۔ دو دن کے بعد جب کمرے کو کھولا گیا تو وہ بالکل صحیح سلامت واپس نکل آیا۔ اس نے آتے ہی لوگوں سے کہا مجھے تو وہاں بہت ہی اچھی نیند آئی۔ سب لوگوں کے منھ حیرت سے کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔

منصف نے بڑے بھائی سے پوچھا کہ آخر تمھیں موت کیوں نہیں آتی۔ اس نے کہا کہ میں بے قصور تھا۔ اس نے لڑکے کو بہت سمجھایا کہ وہ اس کے اشارے پر سمندر سے واپس آجائے، لیکن اس نے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اپنی موت آپ مر گیا۔ اس کی بات سُن کر منصف نے اسے آزاد کر دیا اور تمام بھائی اپنی ماں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگے۔

وہم پرستی

سلمہ عمر، کراچی

توہم پرستی درحقیقت ایک مرض ہے جو صدیوں سے انسانی ذہن کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس مرض کی ابتدا کے بارے میں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن قیاس ہے کہ جب بھی انسانی معاشرے پر جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے تو توہم پرستی نے جنم لیا۔

یہ مرض جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن اپنی لپیٹ میں اچھے خاصے معقول اور جدّت پسند لوگوں کو بھی لے لیتا ہے، مثلاً انگریزوں ہی کو لیجیے جو اس صدی کی ابتدا میں اپنی فہم اور فراست کی بہ دولت سارے عالم پر چھائے ہوئے تھے، مگر ان کے ہاں بھی توہم پرستی پائی جاتی ہے۔ ان کی توہم پرستی کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ اگر کالی بلّی راستہ کاٹ لے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جس مقصد یا ارادے سے نکلے ہیں، اس میں انھیں ضرور ناکامی کا سامنا ہوگا۔ اس طرح دنیا کے مختلف علاقوں کے رہنے والے مختلف قسم کے وہموں میں مبتلا ہوتے ہیں، جن میں بعض وہم ایک جیسے ہوتے ہیں، البتہ مخصوص علاقوں اور قوموں کے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان میں بعض اوہام (وہم کی جمع اوہام) یہ ہیں: (۱) اگر کسی کی دیوار پر کوّا کائیں کائیں کرے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس گھر والے کوئی اچھی خبر سننے والے ہیں یا کوئی ایسا مہمان آنے والا ہے جس کی انھیں توقع نہ ہو۔ (۲) کھانا پکانے کا تیل گر جائے تو اسے خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے (۳) تصویر گر جانے کی صورت میں اسے بدقسمتی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے، اور جس کی تصویر گری ہو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پر کوئی ناگہانی آفت نازل ہونے والی ہے۔ (۴) کنواری لڑکی یا لڑکا اگر دیگچی میں کھانا کھائے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی شادی کے دن بارش ہوگی۔ دیکھا جائے تو ان تمام اوہام کا حقیقت سے تعلق نہیں۔

توہم پرستی دراصل صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے جو سائنسی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں بہت سے لوگوں نے صرف توہم پرستی کی بنا پر اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے لہٰذا اپنی زندگی کو خوش و خرم گزارنے کے لیے حتی الوسع توہم پرستی سے گریز کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ مرض تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔

صحت مند نونہال

تابش سلطان، کراچی

منور بانو عثمان، کراچی

کاشف علی، کراچی

تنویر احمد کھڑا، کراچی

داد محمد بہادر، کراچی

سحرش سلیم، سہری پور

غلام مصطفیٰ ملک، ماتلی

عامر اللہ

افشاں مہر، کراچی

ظہر حسین ہاشمی، حیدر آباد

ناصر محمود، ڈیرہ غازی خاں

محمد رشید احمد، بہاول نگر

اسلم پروپر کھوکھر، جیکب آباد

محمد ریاض شفیع، بہاول نگر

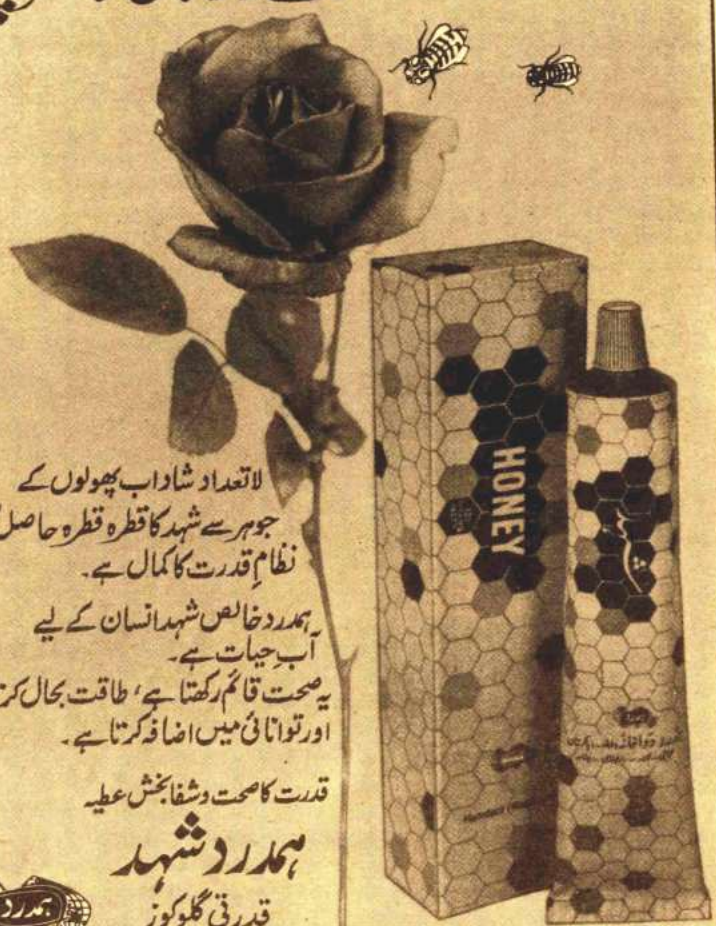

HMD/HNY-1/85 ADARTS

اس شمارے کے مشکل الفاظ

نونہالوں کی خواہش پر ہر لفظ کے سامنے اُس زبان کا اشارہ بھی لکھا جا رہا ہے جس سے وہ لفظ اردو میں آیا ہے۔
یہ اشارے اس طرح لکھے ہوں گے، ع: عربی، ف: فارسی، ہ: ہندی، س: سنسکرت، ت: ترکی، انگ: انگریزی، ا: اردو۔

اوہام :(ع) اَوْہَام : وہم کی جمع، گمان، بُرا گمان۔
اعتدال :(ع) اِعْتِدَال : میانہ روی، کمی نہ زیادتی۔
مقدور :(ع) مَقْدُور : طاقت، حوصلہ، مجال۔
افتخار :(ع) اِفْتِخَار : فخر کرنا، ناز کرنا، عزت بڑائی۔
آشکار :(ف) آشْکَار : ظاہر ہونا، فاش ہونا۔
بندگی :(ف) بَنْدَگی : غلامی، عبادت، رخصت ہوتے وقت سلام، تابعداری۔
بتدریج :(ع) بَتَدْرِیج : درجہ بہ درجہ، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ
مدارج :(ع) مَدَارِج : درجے، رتبے۔
دانائی :(ف) دَانَائِی : عقل، دانش۔
بہرطور :(ف) بَہَر طَور : ہر طریقے سے۔
حکمت :(ع) حِکْمَت : عقل، دانش، دانائی، علم۔
فراز :(ف) فَرَاز : بلندی، اونچائی۔
گرداب :(ف) گِرْدَاب : بھنور، پانی کا چکر
ساکت :(ع) سَاکِت : خاموش، بے حرکت۔
بدر :(ع) بَدْر : چودھویں رات کا چاند۔
دارالاماں :(ع) دَارُالْاَمَان : امن کی جگہ، جہاں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔
رنجش :(ف) رَنْجِش : رنج، اَن بَن، جھگڑا، عداوت۔
سانحہ :(ع) سَانِحَہ : حادثہ، واقعہ۔
صائب :(ع) صَائِب : ٹھیک، صحیح، سیدھا۔
طعام :(ع) طَعَام : کھانا، کھانے کی چیزیں۔
فصیح :(ع) فَصِیح : فصاحت سے باتیں کرنے والا، خوش بیان۔
قضا :(ع) قَضَا : خدا کا حکم، موت، قسمت۔
قضیہ :(ع) قَضِیَہ : جھگڑا، اختلاف، فساد، مقدمہ۔
کوچ :(ف) کُوچ : روانگی، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔
سامع :(ع) سَامِع : سننے والا۔
مسلح :(ع) مُسَلَّح : ہتھیار باندھ کر لڑنے کے لیے تیار۔
مفقود :(ع) مَفْقُود : غائب، کھویا ہوا۔
کسب :(ع) کَسْب : حاصل کرنا، پیدا کرنا، کمانا۔
نشیب :(ف) نِشَیب : پستی، اُتار۔
سِن :(ع) سِن : عمر۔

ننھے قارئین لکھتے ہیں

○ میں نے اس رسالے سے ہمیشہ کچھ سیکھا ہے۔ ایسی باتیں کسی اور رسالے میں نہیں ملتی۔ حیدر رضا، کراچی

○ میں بہت یقین سے لکھ رہی ہوں کہ پورے پاکستان میں نونہال معیاری اور ادبی رسالہ ہے۔ اس لیے یہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نونہال واقعی بچّوں کے دوسرے رسائل سے منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ نونہال کی ہر تحریر بچّوں کے ذہنوں کی تربیت کرتی ہے۔ کلثوم ثروت نذیر، سیال کوٹ

○ ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۶ء کے شمارے کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان دو سال کے دوران نونہال کا معیار کافی بلند رہا ہے۔ اس لیے میں نونہال کے مصنف "جناب حکیم محمد سعید صاحب" کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ انیس مسعود حسین، کراچی

○ اس دفعہ جاگو جگاؤ نے دل پر بہت اثر کیا۔ کہانیوں میں دوست (وقار محسن)، خیر دین کا لالو (میرزا ادیب) اور جادوگر شہر میں رہنے چلا (مناظر صدیقی)۔ بہت ہی مزے دار تھیں۔ نونہال ادیب میں بابا کرم دین اور سچّی خوشی بہت ہی مزے دار تھیں۔ لطیفے بھی چٹ پٹے تھے۔ انکل اگست میں میری سال گرہ ہو رہی ہے مجھے کیا تحفہ دیں گے؟ محمد جنید، کالاباغ

ڈھیروں مبارک باد اور ہزاروں دعاؤں کا تحفہ پیش ہے۔

○ اگست کا شمارہ پسند آیا۔ میں نے آپ سے "متنفر" کے معنی پوچھے تھے۔ سعدیہ خلجی، کراچی

مُتنفِّر کے معنی ہیں نفرت کرنے والا یا بیزار۔

○ تمام رسالہ بہترین تھا۔ دلشاد احمد صاحب کی تجویز ہے کہ خاص نمبر اگست میں شائع کیا جائے۔ میں اتفاق کرتا ہوں۔

ندیم احمد، کراچی

دوسرے نونہال بھی اپنی رائے لکھ کر بھیجیں۔

○ آپ تمام سائنسی مضامین علم کیمیا یا طبیعیات کے شائع کرتے ہیں مگر کبھی جانوروں یا پودوں کے بارے میں مضمون شائع نہیں کرتے۔ رابعہ ثانی، لطیف آباد

خاص نمبر میں "ساحلی جنگلات" پڑھا ہوگا۔

○ حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ ہمیشہ کی طرح نصیحت آموز تھا۔ کہانیوں میں دوست اور ایک اندھا اور ایک لنگڑا پسند آئیں۔

محمد ساجد، کراچی

آپ نے دو خط کیوں لکھے؟ ایک ہی خط لکھنا چاہیے۔

○ نونہال واقعی نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے شائع ہوتا ہے۔ شمع پروین، نواب شاہ

○ خاص طور پر جادوگر شہر میں رہنے چلا، دوست اور خیر دین کا لالو بے حد پسند آئے۔ سلمیٰ ستار گھانچی، کراچی

○ نونہال جیسا رسالہ پورے ملک بھر میں نہیں ہے۔

عالمگیر آفریدی، جمرود خیبر ایجنسی

○ سائنسی مضمون بھی بہت پسند آیا، لیکھا رفیع اللہ بلوچ نے نعت ایک نعتوں کی کتاب میں سے نقل کی تھی اور نسیم اختر، کراچی نے نظم جاگا جاگا پاکستان اردو کی چوتھی کتاب میں سے نقل کی تھی اور محمد عاطف شیخ، نواب شاہ نے کہانی ایفائے عہد اردو کی آٹھویں کتاب میں سے نقل کی تھی۔ محمد اکرم عالم انصاری، حیدر آباد

مستقبل کے تینوں درخشندہ ستارو! تم ہی بتاؤ کیا جواب دوں؟

○ خاص طور پر معلوماتی مضمون زمین کے متعلق جدید معلومات بہترین تھا۔ مسعود احمد برکاتی صاحب آپ پہلی بات ہر ماہ لکھا کریں۔ مجھے آپ کا سفرنامہ دو مسافر دو ملک چاہیے قیمت بتادیں۔

اسرار الحق خانزادہ، ٹنڈو جام

دو مسافر دو ملک ابھی چھپا نہیں ہے، جلد ہی چھپنے والا ہے۔

○ اگست میں ساقی جاوید کی نظم جاگا جاگا پاکستان اردو کی پانچویں کی کتاب سے نسیم اختر نے نقل کر کے لکھی تھی۔ عبداللہ شرجیل، کراچی

○ ہم نونہال جب سے پڑھ رہے ہیں جب سے ہم نے پڑھنا سیکھا اور یہ ہمارے گھر ۱۹۷۰ء سے تقریباً باقاعدہ آرہا ہے۔ اس لیے جب ہمیں پڑھنا نہیں آتا تھا تب ہم سنتے تھے اور جب میں خطوں میں یہ پڑھتی تھی کہ آپ یہاں کے خط شائع کرتے ہیں وہاں کے نہیں کرتے تو میں سوچتی تھی کہ ایسا نہیں ہوتا، لیکن اب مجھے پکا یقین ہو گیا کہ ایسا ہوتا ہے، اس لیے کہ آپ نے ذکیہ ایوب کو دو مرتبہ بزم نونہال میں شرکت کے لیے بُلایا، لیکن ہمیں ایک مرتبہ بھی نہیں۔

سائرہ عتیق، درخشاں سوسائٹی

پہلے یہ بتادوں کہ آپ نے پتا اس خط میں بھی نہیں لکھا۔

○ نونہال کا معیار اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے نونہالوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب میری آئیڈیل شخصیت ہیں۔ خطوں کے جواب دینے کا انداز بہت عمدہ ہوتا ہے۔ مہربانی کر کے یہ بتادیں کہ خطوں کے جواب کون دیتے ہیں؟

سید شہباز علی شاہ، سول لائن جہلم

جوابات مدیرِ اعلا کی طرف سے ہوتے ہیں۔

○ جناب حکیم محمد سعید کا جاگو جگاؤ خوب تھا۔ اس کو اگر رسالے کا دل کہا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ ماضی میں دو کہانیوں نے تو کمال ہی کر دیا تھا یعنی دو مسافر دو ملک۔ اتنا دل چسپ سلسلہ پھر آج تک نونہال میں نہیں ملا۔ اگر یہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے تو یہ ارسال کر دیں۔

شبیر حسین صدیقی، شکار پور

○ محترمہ کنیز فاطمہ غازی کا مضمون "توتا آزاد ہو گیا" میں توتے کو ہر جگہ توتا لکھا گیا ہے۔ جب کہ میں نے ہر جگہ طوطے کو "ط" سے لکھا ہوا دیکھا ہے۔

سید سرور علی، کراچی

پرانی کتابوں میں تو "توتا" ہی تھا، لوگوں نے "طوطا" کر دیا۔

○ کاش یہ ردی کی ٹوکری نہ ہوتی جس میں ہمارے خط جا کر مچھلی کی طرح پھنس جاتے ہیں۔

شفقت رسول گو پانگ بلوچ، جام پور

○ میں خطوط بھی پورے پڑھتا ہوں۔ میں نے ایک خاص بات ہمیشہ یہ دیکھتا ہوں عام طور پر بچے لکھتے ہیں کہ میرا خط نونہال میں کیوں نہیں چھپتا۔ ہماری تصویریں، ہمارے نام کیوں نہیں چھپتے؟ ہماری کہانی کیوں نہیں شائع ہوتی۔ آپ ہمارے دشمن ہیں۔ آپ صرف کراچی والوں کے سب کچھ شائع کرتے ہیں۔ اس لیے میں ان نونہالوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ ہمدرد نونہال کا اصل مقصد نونہالوں کے لیے ایسا ادب پیش کرنا ہے جس سے ان میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو، نیکی اور سچائی، انصاف اور ہمدردی، جرأت اور بہادری، ٹھنڈے دل سے سوچنے کی عادت اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی صفت پیدا ہو۔ چناں چہ میں توقع کرتا ہوں کہ تمام نونہال ہر ماہ بلند سے بلند تر ہوتے جائیں گے جس میں ایسی عمدہ، مفید اور دل چسپ بات ہو کہ جو کسی کے کہے بغیر خود ہی اپنے آپ کو چھپوائے۔

وزیر حسین شاہ نقوی، خیر پور میرس

اور اگر ان کی تحریر نہ چھپے تو سمجھ لیں کہ تحریر میں یہ خوبیاں نہ تھیں۔

○ تحفے میں صفحہ ۲۷ پر (اگست) اونٹ اور گھوڑے والے سوال کے جواب میں آپ نے ایک بکری لکھا ہے، لیکن ایک بکری کی جگہ دو بکریاں آئیں گی۔

محمد اقبال، اکڑی پنھورو

اقبال میاں، خوب پکڑی تم نے غلطی۔ واقعی جواب میں تین اونٹ، ۱۵ گھوڑے اور ۲ بکریاں ہونا چاہیے۔

○ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ میں کتاب جاگو جگاؤ منگوانا چاہتا ہوں۔ کتنے پیسے ارسال کروں؟

ریاست خان، عور غشتی

آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا۔ شاید بھول گئے۔ جب خط لکھنے بیٹھیں تو سب سے پہلے اپنا پتا لکھا کریں۔ میاں "جاگو جگاؤ" کی قیمت ۵ رُپے ہے۔ تین رُپے رجسٹری کے خرچ ہوں گے۔ کُل آٹھ رُپے آپ کو بھیجنے پڑیں گے۔

○ میں ہمدرد کی کتابیں سکھر میں کس جگہ سے حاصل کر سکتا ہوں؟

سید نجم الحسن زیدی، سکھر

سکھر میں ہمدرد کی کتابیں اس پتے سے مل سکتی ہیں: مہران بک کارپوریشن نمبرہ دوسری منزل، مہران مرکز، سکھر

○ ساجد علی ساجد کا "جب میکسیکو میں..." دو غلطیاں تھیں (۱) صحیح یہ ہے کہ یہی فائنل میں جرمنی نے فرانس کو دو گول سے ہرایا تھا۔ (۲) فائنل میں ارجنٹینا کی طرف سے تیسرا گول کرنے والے کھلاڑی کا نام بردکگا غلط

لکھا گیا ہے صحیح نام بروشا گا ہے۔

سمیع اللہ، فیصل آباد

○ جاگو جگاؤ اور پہلی بات اچھی تھیں۔ خاص نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ اگست کا مہینہ آئے بغیر تمبر شروع ہو جائے۔

فاطمہ افشاں، کراچی

○ فیض لدھیانوی کی نظم "جشنِ آزادی" بہت اچھی ہے۔

وسیم صادق، کراچی

○ زمین کے متعلق مضمون بہت پسند آیا۔

سنجیدہ بانو، شبنم کلام، عدنان جہانگیر شیخ، راول پنڈی

○ کہانیوں میں خیر دین کا لالو (میرزا ادیب) بہت پسند آئی۔

ثمرین جمال، رخشندہ فیروز، فرخندہ فیروز، کراچی

○ میں نونہال ۱۹۷۷ء سے پڑھ رہی ہوں۔ خود بھی پڑھتی ہوں اور اپنی سہیلیوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتی ہوں اور خریدنے کا مشورہ دیتی ہوں۔ سب کو نونہال بہت پسند ہے۔ ہمارے گھر کے سارے افراد ہمدرد نونہال بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

گلشن منور حسین بٹ، لاہور

○ اگست کا نونہال جگنو کی طرح چمکتا دمکتا ان ننھے ہاتھوں میں آیا۔ جاگو جگاؤ تو گلاب کے پھول کی مہک کی طرح تھا۔ کہانیاں تمام بہتر تھیں۔ نظمیں ایسی تھیں جیسے نونہال میں جاگو جگاؤ۔

محمد ذاکر قریشی، ٹنڈو الہ یار

○ نونہال میرا اور میرے بہت سے دوستوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔

محمد آصف انصاری، کراچی

○ اپنا پیچم ایک بے اچھی کہانی تھی۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔

رب نواز ظفر، ڈیرہ مراد جمالی

○ جاگو جگاؤ بہت اچھا تھا۔ توتا آزاد ہو گیا، ایک اندھا ایک لنگڑا، خیر دین کا لالو اور مسکراتے رہو قابلِ تعریف ہیں۔

فاخرہ زینب، اسکندر آباد

○ حکیم صاحب کا جاگو جگاؤ بہت ہی اعلا تھا۔ کارٹون بہت اچھے تھے۔ لطیفے بس ٹھیک تھے۔

محمد علی نقوی، کراچی

○ جاگو جگاؤ اور دیگر تحریروں نے میرے خوابیدہ ذہن کو جلا بخشی۔ خیال کے پھول اور تحفے کا معیار پہلے سے اچھا تھا۔ میری تجویز ہے کہ آپ ناقابلِ اشاعت کا کالم شروع کر دیں۔

عبدالرشید تبسم، حاصل پور

○ امتحان میں پاس ہونے پر میری آنٹی نے تحفے میں نونہال دیا ہے۔ اب میں اپنے جیب خرچ سے خرید کر نونہال پڑھتا ہوں۔

وسیم احمد، ٹنڈو الہ یار

○ ہمدرد نونہال کا خاص نمبر اگست میں شائع کیا کریں۔

مدینہ عید محمد، جیکب آباد

○ نظمیں ساری اچھی تھیں۔ خیال کے پھول لاجواب تھے۔ صحت مند نونہال کا صفحہ ختم کر کے اسے تحفے میں بڑھا دیا جائے۔

ثوبیہ رفیق، سعدیہ رفیق، فیصل آباد

○ میری دعا ہے کہ خدا نونہال کو ستاروں سے بھی زیادہ روشن کر دے۔

محمد عمران، کراچی

○ نونہال کا ٹائٹل بے کار ہے اور اس کی جگہ کوئی جدید ماڈل کا ٹائٹل دیا کریں۔ نونہال پورے پاکستان کا بہترین اور سبق آموز رسالہ ہے۔

اعجاز آفاق، لطیف آباد

○ اب ہمدرد نونہال کا پہلے جیسا معیار نہیں رہا ہے۔ نہ کہانیاں اس کے معیار کی ہیں نہ کہانیوں کی تصاویر معیاری ہیں۔ معراج صاحب بھی اب پہلے جیسی کہانیاں نہیں لکھ رہے ہیں۔ علی اسد صاحب بھی معیاری کہانیاں نہیں دے رہے ہیں۔ مستقل سلسلوں کی وجہ سے اب تک بات بنی ہوئی ہے۔

جمیل احمد خان، کراچی

○ کہانیوں میں توتا آزاد ہو گیا اور نظم جشنِ آزادی (فیض لدھیانوی) پسند آئی۔

ایم اکبر خان زادہ، ٹنڈو الہ یار

○ اگست کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ خاص طور پر جاگو جگاؤ (حکیم محمد سعید)، پہلی بات (مسعود احمد برکاتی) خیر دین کا لالو (میرزا ادیب) جادوگر شہر میں رہنے چلا (مناظر صدیقی) توتا آزاد ہو گیا (کنیز فاطمہ غازی) اور تحفے بہت پسند آئے۔

عبدالغفور خان، بہاول پور

○ نونہال ایک معیاری رسالہ ہے۔ گھر والے اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

محمد ارشد الندیٰ، کراچی

○ ننھے قارئین لکھتے ہیں کے کالم میں امیر ہاشم صاحب کو رنگی نے جو کچھ کہا ہے بہت ہی غلط کہا ہے۔ انھیں یہ پیغام پہنچا دیں:

ساحل اگر دُور ہو تو رویا نہیں کرتے
امید کی کشتی کو ڈبویا نہیں کرتے

فصیحہ چوہدری، کراچی

○ نونہال ایک نہایت معلوماتی رسالہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ اطہر شفیق، کراچی

○ یہ رسالہ ہمارے گھر پندرہ سال سے آرہا ہے اور ہمارے گھر میں سب اس رسالے کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

فاطمہ صدف، عائشہ صباحت، سائمہ قریشی کراچی

○ نونہال باقاعدگی سے خریدتی ہوں۔ نونہال ایک اچھا رسالہ ہے۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ طاہرہ بنتِ شیر علی، کراچی

○ اگست کے شمارے میں خیال کے پھول، پہلی بات اور جناب مناظر صدیقی کی لکھی ہوئی جادو گر شہر میں رہتے چلا بہت اچھی لگی۔ محترمہ کنیز فاطمہ غازی کی لکھی ہوئی کہانی تو تا آزاد ہو گیا اچھی کہانی تھی۔ اوشاق علی جالی، مولا بخش تانوری، سکھر

○ نونہال ہمارے گھر میں شروع ہی سے آتا ہے اور سب بھائی بہن پڑھتے ہیں۔ کرن نور، کراچی

○ اس رسالے کو مہینے میں دو بار شائع کیا کریں، کیوں کہ اس کو پڑھ کر پھر بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔

حسین بخش مکرانی بلوچ، ٹنڈو محمد خان

○ جاگو جگاؤ پورے نونہال کا دل ہے۔ آپ نونہال کے کچھ صفحے اور بڑھا دیں اور اس میں عظیم شخصیتوں اور کھلاڑیوں کے انٹرویو شائع کریں۔ محمد عدنان شیخ، نواب شاہ

○ اس مرتبہ جاگو جگاؤ میں قربانی کے متعلق پڑھا۔ بہت کچھ حاصل ہوا۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب یہ کالم نہایت دل چسپ لکھتے ہیں۔ محمد حامد قریشی، محمد ساجد قریشی، ملیر کراچی

○ آپ مختلف شخصیات کے انٹرویو بھی دیا کریں جیسے کھلاڑی شاعر اور دوسرے لوگوں کے۔ اللہ نونہال کے سورج کو ہمیشہ عروج نصیب کرے۔ عبدالغنان شہری، سیال کوٹ

○ تازہ رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ سب تحریریں اپنی جگہ بہت اچھی تھیں۔ عرفان حسین، ہمدرد نگر

○ الگ الگ کہانیوں کی کیا تعریف کروں۔ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ آپ کا ہر ماہ کا رسالہ نہایت دل چسپ مزے دار اور چٹ پٹا مسالے دار ہوتا ہے۔ طب کی روشنی میں اپنے پیارے ہمن بھائیوں کے سوالات اور آپ کے جواب مع علاج پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ تجمل عرف گڈو، لاہور

○ نونہال کو میں نے ایک مکمل رسالہ پایا ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ عدنان عادل، کراچی

○ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ بہت پسند ہے۔ عامر نوید طاہر، کراچی

○ سرورق خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں خیر دین کا لالو، (میرزا ادیب) ایک اندھا اور ایک لنگڑا (ڈاکٹر شمیم حنفی) پسند آئیں۔ لطیفے معیاری تھے۔ منتخب کہانیوں میں اپنا پروجم ایک ہے اچھی تھیں۔ جمیل الدین، کراچی

○ اس رسالے سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہمیں ہمارے ماں باپ بچوں کا یہ رسالہ کیوں نہیں پڑھنے دیتے۔ ہم اس رسالے کو پڑھتے ہیں۔ محمد اعجاز رحمانی، فیصل آباد

○ کہانیوں میں وقار محسن کی دوست، میرزا ادیب کی خیر دین کا لالو، ڈاکٹر شمیم حنفی کی ایک اندھا اور ایک لنگڑا بہت پسند آئیں۔ محمد عامر بیٹ، کراچی

○ منتخب کہانیاں بھی پسند آئیں۔ اس بار بھی لطیفے خاص نہ تھے۔ نونہال ادیب کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

پرنس زرتاج احمد، کراچی

○ زمین کے متعلق جدید معلومات لاجواب تھیں۔ رسالے میں آپ نے فٹ بال کو مستقل سلسلہ بنا دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ایک صفحہ کرکٹ کے لیے وقف کر دیں۔

محمد امین خان سوز، محمد سلیم خان کھلاڑ ٹاؤن

○ حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ اور برکاتی صاحب کی پہلی بات پسند آئی۔ لطیفے مزے دار تھے۔ سید عدنان علی، کراچی

○ تمام لطیفے اور کہانیاں پسند آئیں۔

عنبرین یوسف، پشاور

○ پہلی تاریخ کو جب ہمارے اخبار والے نے آواز لگائی تو دوڑا اور سیڑھیوں سے پھسل کر گر پڑا پھر بھی دوڑ کر نونہال لے کر سینے سے لگالیا۔ سجاد احمد بلوچ، جام پور

○ اگست کا خوش بُو سے بھرا ہوا پھولوں کا گل دستہ ملا۔

پُرنم جان، کراچی

○ خیال کے پھول، طب کی روشنی میں، کارٹون، تحفے، جب میکسیکو میں فٹ بال کا میلا لگا۔ زمین کے متعلق جدید معلومات، جادو گر شہر میں رہنے چلا، ہمدرد انسائکلو پیڈیا، مسکراتے رہو، بہت پسند آئے۔ عمران خان، کھپرو

○ جناب مسعود احمد برکاتی کی پہلی بات پسند آئی۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ قاضی تنویر عبدالعزیز، کراچی

○ ہمدرد نونہال میں اکثر ننھے بچوں کا دل بہلانے والی کہانیاں ہوتی ہیں۔ حال آنکہ ہمدرد نونہال پڑھنے والوں کی زیادہ تعداد کی عمر آٹھ سے اٹھارہ سال تک ہے۔ آپ کو چاہیے کہ سب کا خیال رکھیں کامران بلوچ مستم ادکاڑہ

○ سرورق بالکل بور لگا۔ جب کہ جون اور جولائی ۱۹۸۶ء کے سرورق قابلِ دید تھے اور انھیں بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔

خواجہ انوار احمد، بھیرہ

○ میرے خیال میں ایک اسلامی سلسلے وار کہانی آپ کو شروع کرنی چاہیے۔ بہادر شیر، کھلابٹ ٹاؤن شپ

○ مضامین تمام اچھے تھے۔ جاگو جگاؤ تو میری جان ہے۔

سمانا ز، کراچی

○ میں حکیم صاحب کا جاگو جگاؤ اور برکاتی صاحب کی پہلی بات بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ لطیفے اور تحفے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اس بار ڈاکٹر شمیم حنفی کی کہانی "ایک اندھا ایک لنگڑا" بہت اچھی تھی۔ نادیہ عزیز، کراچی

○ اخبار نونہال اور دوسرے کالم بھی اچھے تھے۔

منیر احمد منیر، لاڑکانہ

○ ہمارے ہاں نونہال تقریباً گیارہ سال یعنی ۱۹۷۵ء سے آرہا ہے اور یہ ہمارا اور ہمارے گھر والوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔

سید ساجد حسین

○ ساری کہانیاں مزے دار تھیں۔ رابعہ صغیر، کراچی

ان نونہالوں کے نام جنھوں نے ہمیں بہت بہت اچھے لکھے، لیکن جگہ کی کمی کے باعث ان کے صرف نام دیے جا رہے ہیں۔

کراچی:۔ محمد یٰسین مالک، رئیس احمد قدیر، محمد مرتضیٰ علی طالب، محمد سہیل خاں، محمد مبشر حسن، محمد عبید اسماعیل، صابرہ بانو کھتری، سید زین العابدین زیدی، شمینہ کنول، منیر مرزا، محمد افضال سرور، ثمینہ بانو زیدی، محمد بن مالک، ارم خورشید، چوہدری منیر کھوکھر، اروحی ابرالی، عبدالغفور کھتری، خواجہ عمر فاروق، سعدیہ اقبال، فرح بانو، ناہید مرزا، ریاض الدین نوری، سید عمار یاسر زیدی، اسلم پرویز، خیر بہادر افغانی مفتون، سعید احمد عباسی، ثمینہ شیخ، ندیم احمد نعمانی، شکیل بھٹی، محمد سعید قریشی، محمد خالد رانا

لاہور:۔ تجمّل حسین۔ شہداد کوٹ:۔ پرکاش کمار۔ سامارو: رفیق احمد قائم خانی، محمد شفیق قائم خانی۔ راول پنڈی:۔ محمد عثمان خان آفریدی۔ قصبہ گجرات:۔ جاوید اقبال بھٹہ۔ حیدر آباد:۔ محمد غلام حسین میمن، زین العابدین۔ نواب شاہ:۔ افشاں مگسی۔ ایبٹ آباد:۔ مبشر عالم۔ مقام نامعلوم:۔ گل جتوئی۔ سیال کوٹ:۔ حاجی محمد عالم۔ جہلم:۔ زربار منہاس، سید شہاب علی شاہ۔ سکھر:۔ سید فخر الحسن زیدی، شریف الحسن۔ بہاول پور:۔ سیدہ تہمینہ الیاس۔ میرپور خاص:۔ کامران وحید۔ گوڈو:۔ راجا محمد سعید۔ مدینہ گجرات:۔ سید وسیم رضا۔ جیکب آباد:۔ ذکیہ سلطانہ مغل۔ یکی شاہ مردان:۔ مدبر اکبر۔

معلوماتِ عامّہ ۲۲۲ کے صحیح جوابات

اس بار بھی سوالات کی تعداد بارہ ہے، لیکن تصویر میں ۱۲ یا ۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی شائع کی جائیں گی دس اور نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ جوابات ۱۵۔ اکتوبر ۸۶ء تک بھیج دیجیے۔ جوابات کے نیچے اپنا صاف نام اور پورا پتا لکھیے۔

۱۔ مکّے کے کافروں سے تنگ آکر سب سے پہلے عرب کے مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔

۲۔ اس ہجرت میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس خود شرکت نہیں فرمائی تھی۔

۳۔ اردو کے ایک جدید ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کے مُصنّف کا نام جناب شہزاد منظر ہے۔

۴۔ مولانا محمد علی جوہر نے "کامریڈ" کے نام سے ایک انگریزی ہفت وار اخبار کلکتے سے جاری کیا تھا۔ ایک اردو اخبار ہمدرد دہلی سے نکالا تھا۔ ہمدرد کا پہلا شمارہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو نکالا تھا۔

۵۔ سندھ کے ایک بہت مشہور بزرگ اور ہفت زبان شاعر حضرت سچل سرمست (عبدالوہاب) کو منصور ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔

۷۔ ایک میگا ٹن میں دس لاکھ ٹن ہوتے ہیں۔

۸۔ شہر "کاسابلانکا" مراکش میں ہے۔

۹۔ ایک عام سیل (جو ٹارچ میں بھی استعمال ہوتا ہے) ۱۶۵۔ وولٹ (VOLTS) کا ہوتا ہے۔

۱۰۔ مشہور مسلمان سائنس داں ابن الہیثم کو بابائے بصریات کہتے ہیں۔

۱۱۔ سب سے زیادہ آنکھوں کے عطیات ایشیا کا ملک سری لنکا دیتا ہے۔

۱۲۔ برازیل کے دارالحکومت کا نام برازیلیا ہے۔ برازیلیا سے پہلے برازیل کے دارالحکومت کا نام ریوڈی جنیرو تھا۔

بارہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی
بُشرہ ظفر انوار
مجیب ظفر انوار
خالد اقبال، شہداد پور
شہداد پور
محمد وسیم شیخ
جیکب آباد
شاہد علی سومرو

۱۲ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

عامر رشید، شہداد پور

نوید ظفر انوار نوی، کراچی

شفقت ہزار، کراچی

ثمینہ نوشین، کراچی

محمد شعیب، کراچی

سید حسین حیدر، کراچی

منیر احمد میمن، جیکب آباد

شازیہ نور نظامی، کراچی

انصار عالم قدیر، کراچی

عتیق الرحمٰن، کراچی

محمد اجمل خاں، کراچی

رئیس احمد قدیر، کراچی

محمد ریحان خاں، کراچی

۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

محمد حسین، جیکب آباد　امیر محمد، جیکب آباد　حمیرا اوصاف، سکھر　عامر ریحان سیال، شیخو پورہ

کراچی	وقار احمد	اسلم پرویز	خواجہ مدین احمد
سائرہ نور	نعمان ادریس	سعیدہ خاتون	
محمد علی ابراہیم	فرخ ادریس	عدنان عیاث الدین	

۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

سید محمد زبیر، کراچی | محمد ریاض الدین قریشی، کراچی | سید سرور علی، کراچی | بنتِ ممتاز، راول پنڈی | سید ابرار حسین، راول پنڈی

فہیم اوصاف، سکھر | محمد عدنان خان، کراچی

دس صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی	آصف خاں	خواجہ معین احمد	نوقیر محمد صدیقی، خیرپور میرس
صابر اختر	شیر زماں	خواجہ متین احمد	قدیر محمد صدیقی، "
ریاض یوسف	قاضی تنویر عبدالعزیز	یاسمین ارم	فیاض احمد سومرو، "
قمرالاسلام	نوید احمد	سید زین العابدین زیدی	محمد عرفان، لاہور
سعید بشیر	اشہر سعید عالم	کاشف سلیمان آرائیں، ڈگری	عبدالرشید سرکی، تحصیل ٹھل
عبدالوحید	سید ثاقب رضا جعفری	صغیر احمد صدیقی، خیرپور میرس	عمران حنان، شیخوپورہ
محمد یاسین مالک	سید محمد عارف	ثمینہ انجم صدیقی، "	نیر توحید، "

نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

سید وجاہت علی
محمد اشرحسن
محمد ظفر ایوب
محمد ذیشان ایوب
محمد سہیل ایوب
محمد اشرف ایوب
محمد اظہر ایوب
شاہد اقبال شاہد
محمد خالد رانا
شیر بہادر افغانی
عبدالرؤف بدر

محمد سرفراز سردار
ہاشم موسیٰ
علی ذوالقرنین
محمد ریاض سردار
سید عماد یاسر زیدی
توقیر شمشیر علی چوہان
عارف حسین
خیرپور میرس
عرفان احمد سومرو
احسان احمد سومرو
اعظم علی سومرو

حیدرآباد

پرنس عبدالجبار میمن
پرنس اشفاق رحیم میمن
سانگھڑ
محمد امین سیف الملوک
ندیم عمردین
طلعت مبین لغاری
واہ کینٹ
پروینہ احمد شیخ
ناہید یحییٰ جہانگیر
فیصل آباد
سمیع اللہ

خالد محمود
کوٹ غلام محمد
سید عباس حیدر نقوی
خیرپور
پرنس عبدالستار میمن
لاہور
تجمل الیاس
سنجھورو
محمد طاہر آرائیں
گوجرانوالہ
سہیل صدیق

اقوالِ زرّیں

- لوہے کی مضبوط دیوار گرائی جاسکتی ہے، مگر بلند کردار کی تسخیر ناممکن ہے۔
- اتنی بلند دیواروں والے محلوں میں نہ رہو جس میں تمہاری آواز گھٹ کر رہ جائے۔
- علم حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔
- کاشت کرنا ہے تو پھول بوؤ تاکہ تمہارا ماحول گلزار بن جائے۔
- بدی کے اندھیرے صرف علم کی روشنی ہی سے چھٹ سکتے ہیں۔
- آنکھوں والا وہ ہے جو اپنے عیب اور دوسروں کے ہنر دیکھے۔

مرسلہ: عرفان احمد، دائرہ دین پناہ

آوازِ اخلاق

پاکستان سے محبت کرو ـ پاکستان کی تعمیر کرو

یہ مُسکراتے
خُوب صُورت نونہال...
Naunehal
herbal gripe wat
نونہال
نونہال ہربل گرائپ واٹر
بچوں کو مطمئن، مسرور اور صحت مند رکھتا ہے
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
اعلاءِ اخلاق
HMD-NGW-3/86